Registered No. L. 4186

جمادی الاولیٰ ۱۳۵۹ھ

جلد ۱۶ — عدد ۵

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک - پونچھ روڈ - لاہور

قیمت سالانہ ھر

قیمت فی پرچہ ۵ر

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابو الاعلی مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے - اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدھا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنھوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انھی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلواربند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحّص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بیجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور

فہرست مضامین

جمادی الاولیٰ ۱۳۵۹ھ (مطابق جولائی ۱۹۴۰ء) جلد ۱۶۔ عدد ۵

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس سرکلر روڈ، لاہور میں طبع ہوکر
دفتر ترجمان القرآن، مبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور سے شائع ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پچھلی اشاعت میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ اسلام تمام عالم انسانی کے لیے بنیادی اصلاح کا ایک پیغام اور عملی اصلاح کا ایک انقلابی پروگرام لے کر آیا ہے، یعنی اس کا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان اللہ وحدہٗ لاشریک کی حاکمیت تسلیم کریں حتیٰ کہ اس کے حکم کے سوا ہر دوسرا حکم باطل ہو جائے، اور اس کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں وہ ایک جتھا بنا کر اپنا پورا زور اس بنیادی اصلاح کو عملاً نافذ کرنے میں صرف کر دیں یہاں تک کہ اشخاص کی، خاندانوں اور طبقوں کی، قوموں اور نسلوں کی فرمانروائی، اور جمہور کی حکومت خود اختیاری بالکلیہ مٹ جائے اور خدا کی سلطنت میں اُس کی رعیت پر صرف اسی کا قانون عملاً جاری ہو۔ یہی پیغام اور یہی پروگرام انبیاء علیہم السلام ابتدا سے لے کر آتے رہے ہیں، اسی ایک مقصد پر انہوں نے اپنی تمام سعی و جہد کو مرکوز کیا ہے، اور مسلمان جو انبیاء کے وارث اور ان کے پیرو ہیں، ان کے لیے بھی اس کے سوا نہ کوئی دوسرا مقصد ہے اور نہ کوئی دوسری راہ عمل۔ مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں پر مجھے جو کچھ اعتراض ہے وہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو مسلم (یعنی متبعین انبیاء) کہنے کے باوجود انہوں نے اس نصب العین اور اس راہ عمل کو چھوڑ کر ایسے مقاصد اور طریقے اختیار کر لیے ہیں جن کو اسلام سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

اُن لوگوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے علم سے بالکل ہی بے بہرہ ہیں، آج تک مجھے کوئی مسلمان، خواہ وہ

کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، ایسا نہیں ملا جس نے اس اعتراض کو حسن کر اصولی حیثیت سے صحیح تسلیم نہ کیا ہو۔ سب مانتے ہیں کہ بلاشبہ مسلمان کا اصلی کام یہی ہے اور اسی منزل کی طرف انبیا علیہم السلام نے ہماری رہنمائی کی ہے لیکن جواب میں دو مختلف سمتوں سے دو مختلف آوازیں آتی ہیں۔

"آزادی پسند" علما اور ان کے ہم خیال مسلمان اس راستہ پر آنے کی مشکلات یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر صرف مسلمان آباد ہوتے، یا مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی جیسی مصر، ایران، عراق وغیرہ ممالک میں ہے تب تو ہمارے لیے آسان تھا کہ حکومت الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتے، اور اس صورت میں اس کے قائم ہونے کا امکان بھی تھا، مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں ہم قلیل التعداد ہیں۔ اکثریت غیر مسلم ہے، حکومت الٰہیہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتی ہے، اور صرف مشترک وطنی حکومت ہی کے نصب العین تک اس کی نظر جا سکتی ہے۔ اوپر انگریزی حکومت بیٹھی ہے جو ہمیں اور غیر مسلم ہمسایوں کو ایک ساتھ دبائے ہوئے ہے۔ خود مسلمانوں کی آبادی کا کثیر حصہ بھی اخلاقی و اعتقادی حیثیت سے انتہائی تنزل کی حالت میں ہے۔ لہٰذا اس وقت جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ مشترک حکومت کے نصب العین کو قبول کر کے، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر انگریزی اقتدار سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد آزاد ہندوستان میں ہم اپنی قوتوں کو پھر مجتمع کریں گے اور اپنے اصلی نصب العین کے لیے جدوجہد شروع کر دیں گے اس کے سوا اور کوئی راستہ اس وقت قابل عمل نہیں ہے۔

دوسری طرف مسلم لیگ اور اس کے ہم خیال لوگ اپنی مشکلات کو ایک دوسرے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں اول تو قلیل التعداد ہیں، پھر تعلیمی اور معاشی حیثیت سے ہماری قوت بہت کم ہے۔ اور مزید براں ایک ایسی تنگ نظر اکثریت نے سیاسی اور معاشی قوتوں کے منابع پر تسلط حاصل کر لیا ہے جو عملاً تو ہم کو ایک الگ قوم سمجھ کر تعلیم حاصل کرنے اور پیٹ بھرنے کے ہر دروازے سے دور ہٹاتی ہے، مگر سیاسی اغراض کے لیے اصولاً ہمارے مستقل قومی وجود سے انکار کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ "ہم ہندوستانی قوم" میں

شامل ہو کر یہاں ایک ایسی جمہوری حکومت قائم ہو جانے دیں جس میں سیاسی طاقت کے حصول کا ذریعہ محض ووٹوں کی کثرت ہو۔ اس مقصد میں اس کے کامیاب ہو جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنی قومی شخصیت ہی کو سرے سے کھو دیں، پھر بھلا حکومت الٰہیہ کا خواب کہاں دیکھا جا سکے گا۔ لہٰذا سر دست اس کے سوا کوئی قابل عمل صورت نہیں ہے کہ جس طرح دنیا کی اور سب قومیں اپنی تنظیم کیا کرتی ہیں اسی طرح ہم بھی اپنی تنظیم کریں، اور دنیا میں جس طرح سیاسی لڑائی لڑی جاتی ہے اسی طرح ہم بھی لڑ کر سب سے پہلے اُن علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اُسی جمہوری دستور کے مطابق جو انگریزی تصورِ جمہوریت کے تحت بنتا ہے، اپنی حکومت قائم کر لیں۔ بعد میں جب اختیارات ہمارے ہاتھ میں آ جائیں گے تو ہم مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اخلاقی و تمدنی حالت کو درست کر کے رفتہ رفتہ حکومت جمہوریہ کو حکومت الٰہیہ میں تبدیل کر لیں گے، اور اللہ نے چاہا تو پھر باقی ہندوستان کی بازیافت کے لیے بھی جدوجہد کرتے رہیں گے۔

بظاہر دونوں فریقوں کے خیالات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر انہی دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن مشکلات کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں ان میں قطعاً کوئی وزن نہیں ہے، بلکہ خود یہی بات کہ حکومت الٰہیہ کے راستہ میں ان کو اس نوعیت کی مشکلات نظر آتی ہیں، اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ انہوں نے اسلامی تحریک کے مزاج اور اس کے طریق کار (TECHNIQUE) کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔ زیادہ گہرائی میں جانے کی بھی کچھ ایسی زیادہ ضرورت نہیں، اگر اس تحریک کی تاریخ ہمارے سامنے ہو تو بادی النظر ہی میں ان عذرات کی غلطی نمایاں ہو جاتی ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی رسول آیا ہے، اکیلا ہی آیا ہے۔ اقلیت اور اکثریت کا کیا سوال، وہاں سرے سے کوئی "مسلمان قوم" موجود ہی نہ تھی۔ ایک نبی قوم بلکہ ایک نبی دنیا کی حیرت انگیز اقلیت کے ساتھ رسول یہ دعویٰ لے کر اٹھتا ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنے آیا ہوں۔ چند گنے چنے آدمی اس

کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور یہ آٹے میں نمک سے بھی کم اقلیت، حکومت الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ اکثریت کا سمندر اس کے ساتھ جو کچھ سلوک کرتا ہے، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کے اُس قہر و تسلط کی سب سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے جس کا نوحہ کرتے کرتے ہمارے "مسلم قوم پرست" بھائیوں کے آنسو خشک ہوئے جا رہے ہیں۔ دفتروں کی ملازمت، منڈیوں کے کاروبار اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے معاملات کا کیا ذکر، وہاں سانس لینے کا حق بھی اس اقلیت کو نہیں دیا جاتا تھا۔ پھر حکومت، خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، جس پنجۂ ظلم و شکنجۂ قہر میں اُن کو کستی تھی، اُس کو کسی معنی میں بھی ہندوستان کے اُن انگریز فرمانرواؤں کے برتاؤ سے تمثیل نہیں دی جا سکتی جن کے ظلم و جور کا رونا ہمارے "آزادی پسند" بھائی رات دن رویا کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی کچھ ضروری نہ تھا کہ بہرحال رسول اور اصحاب رسول حکومت الٰہیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے ہوں۔ بارہا وہ اس مقصد میں ناکام ہوئے ہیں۔ ان کو اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے، اور خدائی کے جھوٹے مدعیوں نے اپنی دانست میں اس تحریک کا قلع قمع کر کے چھوڑا ہے۔ مگر اس کے باوجود جو لوگ اللہ پر ایمان لائے تھے، اور جن کے نزدیک کرنے کا کام بس یہی ایک تھا، انہوں نے آخری سانس تک اسی مقصد کے لیے کام کیا، اور کسی ایک نے بھی اکثریت کا یا حکومت کا رنگ دیکھ کر، یا وقتی و مقامی مشکلات کا خیال کر کے دوسرے راستوں کی طرف ادنیٰ التفات تک نہ کیا۔

پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس تحریک کو اُٹھانے اور چلانے کے لیے خارج میں کسی سامان اور ماحول میں کسی سازگاری کی ضرورت ہے۔ جس سامان اور جس سازگاری کو یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں وہ نہ کبھی فراہم ہوا ہے، نہ فراہم ہو گا۔ دراصل خارج میں نہیں بلکہ مسلمان کے اپنے باطن میں ایمان کی ضرورت ہے، اس قلبی شہادت کی ضرورت ہے کہ یہی مقصد حق ہے، اور اس عزم کی ضرورت ہے کہ میرا جینا اور مرنا اسی مقصد کے لیے ہے۔ یہ ایمان، یہ شہادت، یہ عزم موجود ہو تو دنیا بھر میں ایک اکیلا انسان یہ اعلان کرنے کے لیے کافی ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی پشت پر کسی منظم اقلیت یا کسی حکومت خود اختیاری رکھنے والی اکثریت کی قطعاً کوئی حاجت نہیں۔ نہ اس امر کی کوئی حاجت ہے کہ اس کا ملک پہلے بیرونی قوم کے

تسلط سے آزاد ہو جائے۔ بیرونی قوم کیا، اور گھر کی قوم کیا، اللہ کے سوا دوسروں کی حاکمیت ماننے والے سب انسان اس کے لیے یکساں ہیں۔ سب کی اس سے اور اس کی سب سے یکساں لڑائی ہے۔ مسیح سے رومیوں نے جو کچھ برتاؤ کیا، اس سے زیادہ ہولناک برتاؤ وہ تھا جو ابراہیم سے ان کی اپنی قوم نے کیا۔

یہ تو وہ بات ہے جو بادی النظر میں ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہے لیکن ذرا زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس نوعیت کی مشکلات کو یہ لوگ اپنی راہ میں حائل پا رہے ہیں وہ دراصل ایک قوم کی مشکلات ہیں نہ کہ ایک تحریک کی۔ جہاں ایک قوم اپنی زندگی اور اپنی قومی اغراض کے لیے جدوجہد کر رہی ہو وہاں تو لا محالہ اسی قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اُس کے لیے ان سوالات میں بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ جس ملک میں وہ آباد ہے وہاں اس کی تعداد کتنی ہے؟ اس میں تنظیم ہے یا نہیں؟ اس کی تعلیمی حالت کیسی ہے؟ اس کی معاشی حالت کیسی ہے؟ اس کے اوپر ایک پتھر کا بوجھ ہے یا دو پتھروں کا؟ انہی سوالات کے جواب پر اس کا مستقبل منحصر ہوتا ہے، اور انہی سوالات کے لحاظ سے اس کو اپنی پالیسی متعین کرنی پڑتی ہے۔ مگر ایک اصولی تحریک جو کسی قسم کی اغراض سے وابستہ نہ ہو بلکہ انسانی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے ایک دعوت لے کر اُٹھے، اس کے سامنے ان سوالات میں سے کوئی سوال بھی نہیں ہوتا۔ اس کے مسائل کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اس کی کامیابی و ناکامی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کے اصول بجائے خود معقول ہیں یا نہیں؟ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو کہاں تک حل کرتے ہیں؟ وہ بالعموم انسانی فطرت کو کس حد تک اپیل کرتے ہیں؟ اور اس کی طرف دعوت دینے والے خود اس کی پیروی میں کتنے مخلص اور کتنے صادق العزم ہیں؟

مسلمانوں کو جو کچھ بھی پریشانی پیش آ رہی ہے اس کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ان کے سوچنے والے دماغوں نے اپنی حیثیت کو ان دو مختلف حیثیتوں کے اندر خلط ملط کر دیا ہے۔ کبھی تو یہ اُن عزائم اور مقاصد کا اظہار کرتے ہیں جن کا تعلق اسلامی تحریک سے ہے، اور ان کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک اصولی تحریک کے پیرو

اور داعی ہیں۔ اور کبھی یہ محض ایک قوم بن کر رہ جاتے ہیں، اس طرح سوچنے لگتے ہیں جس طرح قومیں سوچتی ہیں، ایسے مسائل میں الجھ جاتے ہیں جو صرف قوموں ہی کو پیش آتے ہیں، اور اپنے اس طرزِ فکر کی وجہ سے اُن مشکلات کو سدِّ راہ پاتے ہیں جو محض قومی مقاصد ہی کے لیے سدِّ راہ ہوا کرتی ہیں۔ اِن لوگوں نے آج تک اِن دونوں حیثیتوں کے فرق کو نہیں سمجھا، نہ واضح طور پر طے کیا کہ دراصل یہ ہیں کیا، اسی لیے یہ کوئی ایسی پالیسی ابھی تک اپنے لیے متعین نہ کرسکے جو تناقض سے خالی اور الجھاؤ سے پاک ہو۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ قومیت اور قومی اغراض قابلِ تبلیغ چیزیں نہیں ہیں۔ مثلاً جرمنیت، اطالویت، انگریزیت یا ہندویت کے متعلق کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کرسکتا کہ ان کی طرف دوسروں کو دعوت دی جاسکتی ہے۔ یہ کوئی اصول نہیں ہیں کہ ہر انسان کے سامنے ان کو پیش کیا جاسکے۔ یہ تو نسل، تاریخ اور تمدن کے بنے ہوئے بے لچک دائرے ہیں۔ ان دائروں کے مفاد اور مقاصد سے جو کچھ بھی دلچسپی ہوسکتی ہے انہی لوگوں کو ہوسکتی ہے جو ان دائروں کے اندر پیدا ہوئے ہوں۔ دوسرے دائروں کے لوگوں کو ان سے دلچسپی ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک جرمن اپنی جرمنیت کی بنیاد پر کوئی کام کرنا چاہے تو لامحالہ وہ جرمنوں ہی سے ہمدردی و اعانت کی توقع کرسکتا ہے۔ انگریز کو کیا پڑی ہے کہ جرمنیت کی زندگی یا اس کی برتری کے معاملہ میں اس کا ساتھ دے۔ جرمنوں کا بول بالا کرنے کی تڑپ صرف جرمنوں ہی میں پیدا ہوسکتی ہے، اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ ان کے مقابلہ میں انگریز بھی متحد ہوکر اپنا بول بالا کرنے یا رکھنے کے لیے سینہ سپر ہوجائیں۔ یہ تو ضرور ممکن ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے بعض افراد کو ناجائز ذرائع سے خرید کر اپنا آلۂ کار بنالیں، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریز جرمنیت پر ایمان لاکر جرمنوں کا ولی حمیم بن جائے یا جرمن انگریزیت اختیار کرکے انگریزوں کا حامی و ناصر بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دو قوموں کے درمیان موافقت ہوتی ہے وہاں محض خودغرضی کی موافقت ہوا کرتی ہے اور صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک خودغرضی اس کی مقتضی ہو۔ اور جہاں ان کے درمیان کشمکش و مزاحمت ہوتی ہے وہاں دونوں کو صرف اپنی قومی طاقت، اپنی تنظیم، اپنے معاشی وسائل، اپنی تعداد، اور اپنے آلاتِ جنگ ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے جو قوم کمزور ہو وہ پس جاتی ہے اور جو طاقتور ہو وہ اسے پیس ڈالتی ہے۔ جرمنی کے مقابلہ میں پولینڈ، ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کیوں مغلوب ہوگئے؟

فن لینڈ اور رومانیا کو روس سے کیوں دبنا پڑا؟ اسی لیے کہ مقابلہ ایک قوم اور دوسری قوم کا تھا۔ دونوں طرف قومیتیں تھیں۔ لہٰذا جس کی قومیت تعداد اور آلات و وسائل اور تنظیم میں بڑھی ہوئی تھی اس نے کمزور کو دبا لیا۔ کوئی فریق بھی خالص انسانیت کی بنیاد پر ایسے اصول لے کر نہ اٹھا تھا کہ مخالف فریق کے انسانوں کو اپیل کرتا اور یہ ممکن ہوتا کہ خود دشمنوں میں سے اس کو دوست ملتے چلے جاتے۔

یہ ہوتی ہے ایک قوم کی حیثیت۔ اب غور کیجیے کہ فی الحقیقت کیا مسلمانوں کی حیثیت اس دنیا میں یا اس ہندوستان میں یہی ہے؟ کیا ہم محض نسل، تاریخ اور موروثی تمدن کا بنا ہوا ایک ایسا گروہ (GROUP) ہیں جس کی قومیت دنیا کی تمام قومیتوں کی طرح ناقابلِ تبلیغ ہو؟ کیا ہمارے مقاصد کی نوعیت بھی انہی قومی اغراض و مقاصد کی سی ہے جن پر دوسری قوموں کا ایمان لانا فطرۃً غیر ممکن ہوتا ہے؟ کیا ہمارے مقاصد اسی قسم کے قومی مقاصد ہیں جن کا حصول صرف ایک قوم کی تعداد، تنظیم اور وسائل ہی پر موقوف ہوتا ہے؟ کیا وہ اسلامی حکومت جس کا ہم نام لیا کرتے ہیں محض ایک قومی ریاست (NATION STATE) ہے جس کے قیام کی بنیاد ایک قوم کی کثرت تعداد ہوا کرتی ہے؟ کیا قلیل التعداد ہونے کی صورت میں ہماری حیثیت واقعی ایک قومی اقلیت (NATIONAL MINORITY) کی رہ جاتی ہے جس کے لیے اکثریت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے یا اپنی انفرادیت کے تحفظ کی تدبیریں اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا؟ کیا حقیقت میں دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ہمارے لیے بھی آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ غیر قوم کی حکومت سے نجات حاصل ہو جائے اور کیا اپنی قوم کی حکومت یا اپنے اہل وطن کی حکومت قائم ہو جانا ہمارے مقاصد کے لیے بھی ضروری ہے؟

اگر واقعی یہی ہماری حیثیت ہے تو بلا شبہ وہ سب کچھ صحیح ہے جو مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اس وقت کر رہی ہیں۔ غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد بھی صحیح، برطانوی حکومت اور دیسی ریاستوں کا سہارا لے کر ہندو امپیریلزم کا مقابلہ بھی صحیح، فوج میں اور سرکاری ملازمتوں میں اور انتخابی مجالس میں اپنی نمائندگی کا جھگڑا بھی صحیح، مسلم ریاستوں کی حمایت بھی صحیح، تقسیم ملک کا مطالبہ بھی صحیح، خاکساروں کی فوجی تنظیم بھی صحیح، اور وہ مسلم قوم پرستی

بھی صحیح جس کی بنا پر حق اور اصول سے قطع نظر کر کے ہر اس فائدے کو دانتوں سے پکڑا جاتا ہے جو مسلمان قوم یا مسلمان اشخاص کو حاصل ہوتا ہو۔ غرض یہ سب کچھ صحیح ہے کیونکہ قومیت کا آئین یہی ہے قومیں یونہی کام کیا کرتی ہیں، اور ایک قوم جو کسی اصول کی علمبردار نہیں بلکہ محض اپنی قومی بہتری کی خواہشمند ہو، ان تدابیر کے سوا آخر اور کیا تدبیریں اختیار کر سکتی ہے؟ البتہ ان سب چیزوں کے ساتھ اگر کوئی بات غیر صحیح ہے تو وہ ہماری یہ خوش فہمی کہ یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد بھی ہم اس زمین پر حکومت الٰہیہ قائم کر سکیں گے حالانکہ اس حیثیت میں یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک ملک پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر چھا جانے کی قوت اگر ہے تو وہ صرف ایک ایسی اصولی تحریک ہی میں ہے جو انسان کو بحیثیت انسان کے خطاب کرتی ہو اور اس کے سامنے خود اس کی اپنی فلاح کے فطری اصول پیش کرتی ہو۔ قومیت کے برعکس یہ تحریک ایک تبلیغی طاقت ہوتی ہے۔ قومیت کے حصار، نسلوں کے تعصبات، قومی ریاستوں کے مضبوط بند، کوئی چیز بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ وہ ہر طرف ہر جگہ نفوذ کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کی طاقت کا انحصار اپنے پیرووں کی تعداد یا ان کے وسائل پر نہیں ہوتا، ایک اکیلا آدمی اس کو چلانے کے لیے کافی ہے۔ پھر وہ خود اپنے اصولوں کی طاقت سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں میں سے دوست پیدا کرتی ہے۔ سب قوموں میں سے آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے جھنڈے کے نیچے آنے لگتے ہیں اور وسائل اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ جو فوجیں اس سے لڑنے آتی ہیں ان پر وہ صرف اپنی توپ و تفنگ ہی سے آتش باری نہیں کرتی بلکہ اپنی تعلیم اور اپنے اصولوں کے تیر بھی چلاتی ہے، خون کے پیاسے دشمنوں میں سے اپنے سرگرم حامی ڈھونڈ نکالتی ہے، سپاہی، جنرل، ماہرین فنون، سرمایہ دار، صناع اور کاریگر سب انہی میں سے اس کو مل جاتے ہیں، اور بے سروسامانی ہی میں سے ہر قسم کا سامان نکلتا چلا آتا ہے۔ قومیتیں اس کے سیلاب کے مقابلہ میں کبھی نہیں ٹھیر سکتیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اس کے سامنے آتے ہیں اور نمک کی طرح پگھل پگھل کر اس آب رواں میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے قلت اور اکثریت کے سارے سوالات بے معنی ہیں۔ وہ اس کی ہرگز محتاج نہیں ہوتی کہ کسی منظم اور باوسیلہ قوم کی طاقت اس کی پشت پر ہو۔ وہ قومی حکومت قائم کرنے نہیں اٹھتی کہ قومیں اس کی مزاحمت کر سکیں۔ اسے تو ایک ایسے اصول کی حکومت قائم کرنی ہوتی ہے جو سب قوموں کے لوگوں کی فطرت کو اپیل کرتا

ہے۔ جاہلی تعصبات کچھ دیر تک اس سے لڑتے رہتے ہیں مگر جب فطرت انسانی پر لگا ہوا زنگ چھوٹتا ہے تو وہ کیفیت ہوتی ہے کہ

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف
بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

مسلمان قرآن اور سیرت رسول کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں جس چیز کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، کہیں وہ اسی نوع کی تحریک تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ قوموں کے درمیان رہتے سہتے اور انہی جیسی تعلیم و تربیت پاکر اپنی اصلی حیثیت بھول گئے ہوں اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو قوم کہتے کہتے وہ سب حدود و بندشیں بھی انہوں نے اپنے خیال میں خود اپنے اوپر عائد کرلی ہوں جو ایک قلیل التعداد اور قلیل الوسائل قوم کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔

اگر واقعہ یہی ہے اور مسلمانوں کی اصلی حیثیت ایک عالمگیر اصولی تحریک کے پیروؤں اور داعیوں کی ہے تو وہ سارے مسائل یک قلم اُڑ جاتے ہیں جن پر اب تک مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی رہنما وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ پوری صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ مسلم لیگ، احرار، خاکسار، جمعیت العلماء اور آزاد کانفرنس، سب کی اس وقت تک کی تمام کارروائیاں حرف باطل کی طرح محو کردینے کے لائق ٹھہرتی ہیں۔ نہ ہم قومی اقلیت ہیں، نہ آبادی کے فی صدی تناسب پر ہمارے وزن کا انحصار ہے، نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے، نہ انگریزوں سے وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے، نہ وہ حکومت ہمارے کسی کام کی ہے جو انگریز کی حاکمیت کے بجائے جمہور کی حاکمیت پر مبنی ہو، نہ ان ریاستوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان خدا بنے بیٹھے ہیں، نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے، نہ اکثریت کی بنیاد پر ہمیں قومی حکومت مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں، بندوں پر سے بندوں کی حاکمیت ختم ہوجائے اور حکومت اُس قانونِ عدل کی قائم ہو جو اللہ نے خود بھیجا ہے۔ اس مقصد کو ہم انگریز، والیان ریاست، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور مردم شماری کے مسلمان، سب کے سامنے پیش کریں گے جو اسے قبول کرے گا وہ ہمارا رفیق ہے، اور جو اس

سے انکار کرے گا اس سے ہماری لڑائی ہے بلا لحاظ اس کے کہ اس کی طاقت کتنی ہے اور ہماری کتنی۔

بہ حیثیت اختیار کرنے اور اس تحریک کو لے کر اٹھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے شخصی اور قومی مفاد داغراض کو بھول جائیں، تمام تعصبات سے بالاتر ہو جائیں، اور ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے نظر ہٹالیں جن سے ہمارے حقیر دنیوی فوائد کا تعلق ہے۔ اگر ہم میں ہندوستانیت کا تعصب ہوگا تو فطری بات ہے کہ انگریز اور ہر غیر ہندوستانی کے کان ہماری دعوت کے لیے بہرے ہو جائیں۔ اگر ہم نام نہاد مسلم قومیت کے تعصب میں مبتلا ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو یا سکھ یا عیسائی کے دل کا دروازہ ہماری پکار کے لیے کھل جائے۔ اگر ہم حیدر آباد، بھوپال، بہاول پور اور رام پور جیسی ریاستوں کی حمایت محض اس لیے کریں کہ ان کے رئیس مسلمان ہیں اور ان سے مسلمانوں کو کچھ معاشی سہارا مل جاتا ہے، تو کوئی احمق ہی ہوگا جو اس کے بعد بھی یہ باور کرے گا کہ ہم اسلام کے نظریۂ سیاسی پر ایمان رکھتے ہیں اور واقعی حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ اگر ہم غیر مسلم حکومت کی ملازمت اور غیر اسلامی جمہوری لوارات میں مسلمانوں کی نمائندگی پر جھگڑا کریں، تو ہماری اس آواز میں کوئی وزن باقی نہ رہے گا کہ ہم اصولِ اسلام کی فرمانروائی قائم کرنے اٹھے ہیں۔ اگر ہم تناسب آبادی کے لحاظ سے تقسیم ملک کا مطالبہ کریں تو غیر مسلموں کو ہم میں اور خود اپنے آپ میں سرے سے کوئی فرق ہی محسوس نہ ہوگا کہ وہ اپنا مقام چھوڑ کر ہماری دعوت پر لبیک کہنے کی کوئی ضرورت سمجھیں۔ اگر ہم غیر اسلامی اصول پر مشترک وطنی حکومت قائم کرنے میں حصہ لیں تو ہمارے اس فعل میں اور ہماری اس دعوت میں ایسا صریح تناقض ہوگا کہ ہماری صداقت کیا معنی، صحتِ عقل تک مشتبہ ہو کر رہ جائے گی۔ اس راستہ پر چلنے کے لیے ہمیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔ بلاشبہ اس سے ہمیں بہت سے نقصانات پہنچیں گے، مگر ایسے نقصانات اٹھائے بغیر اسلامی تحریک نہ کبھی چلی ہے نہ کبھی چل سکتی ہے۔ جو کچھ جاتا ہے جانے دو۔ سیدنا مسیح کے بقول جبہ جاتا ہے تو کرتا بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تب ہی خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو سکے گی۔

چند مہینوں سے اس رسالہ کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر واقع ہو رہی ہے حتیٰ کہ ربیع الاول و ربیع الآخر کا مشترک نمبر رجب کے وسط میں شائع ہوا جس سے ناظرین رسالہ کا پیمانۂ صبر بالکل ہی لبریز ہو گیا اور دفتر میں شکایات کا انبار لگ گیا۔ اب اس تاخیر کا اصلی سبب ظاہر کرنے پر میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔

دراصل اس کا سبب وہ شدید مالی مشکلات ہیں جو پچھلے چند مہینوں سے اس رسالہ کو پیش آرہی ہیں۔ دو تین سال اُدھر جن خیالات کی تبلیغ ان صفحات میں شروع کی گئی تھی، اُن سے بعض جماعتیں ناراض ہوئیں تو بعض خوش بھی ہوئیں بعض نے مقاطعہ کیا تو بعض نے گرمجوشی کے ساتھ خوش آمدید بھی کہا لیکن وہ روش اصل مقصد کی محض تمہید تھی۔ جب تمہید ختم ہوئی اور اصل مقصد بے نقاب ہو کر سامنے آیا تو ہندوستان کی مختلف الخیال جماعتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہ تھی جس کو اُس سے اتفاق ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رسالہ کے خریداروں کی تعداد بڑی تیزی کے ساتھ گھٹنی شروع ہو گئی۔ پچھلے سات آٹھ مہینوں میں جن اصحاب کے نام فہرست خریداران سے خارج ہوئے ہیں ان کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔ بالفاظ دیگر اس قلیل مدت کے اندر رسالہ کی آمدنی میں تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے کی کمی واقع ہوئی ہے۔ ایک طرف آمدنی کا یہ نقصان اور دوسری طرف جنگ کی وجہ سے کاغذ کی قیمت بڑھتے بڑھتے دوچند ہو گئی۔ ان دونوں اسباب نے مل جل کر وہ موانع پیدا کر دیے ہیں جن کی وجہ سے پرچہ کو بر وقت شائع کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

ان حالات کے اظہار کا مقصد محض ناظرین کی اُس پریشانی کو دور کرنا ہے جو اشاعت میں غیر معمولی تاخیر سے ان کو پیش آرہی ہے۔ میں کسی سے ہمدردی یا اعانت کا خواہشمند نہیں ہوں۔ جو لوگ میرے خیالات سے متفق نہیں ہیں وہ اگر اختلاف رائے کو برداشت کر سکیں اور اپنے مخالف کے نقطۂ نظر سے آگاہ رہنے کی ضرورت سمجھیں تو رسالہ کو خریدیں ورنہ بند کر دیں۔ اس امر کی توقع کسی کو مجھ سے نہ رکھنی چاہیے کہ محض رسالہ کو زندہ رکھنے کے لیے میں اس کی پالیسی میں کوئی ایسی ترمیم کروں گا جو لوگوں کو خوش کرنے والی ہو اور (کم از کم میرے علم کے مطابق) خدا کو ناخوش کرنے

والی ہو رہے وہ لوگ جو میرے مقصد اور طرز عمل سے اتفاق رکھتے ہیں تو ان سے بھی میں کسی ہمدردی و اعانت کی درخواست نہیں کرتا۔ وہ اپنے ضمیر سے فتویٰ لیں کہ جس مقصد کے لیے میں کام کر رہا ہوں وہ مقصد حق ہے یا نہیں، اور جس راستہ پر چل کر میں نے دنیا بھر سے اختلاف مول لیا ہے وہ صراط مستقیم ہے یا نہیں۔ اگر ان کا ضمیر اثبات میں جواب دے تو انہیں خود ہی فیصلہ کرنا چاہیے کہ اس معاملہ میں ان کا فرض کیا ہے۔ وہ اپنے فرض کو محسوس کر کے ادا کریں تو عندی و عند اللہ مشکور ہوں گے۔ نہ محسوس کریں اور نہ ادا کریں تو میں اپنی حد وسع تک کام کرتا رہوں گا، کیونکہ میرے ایمان کی وجہ سے جو فرض مجھ پر عائد ہو چکا ہے اُس کی بجا آوری اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی میرا ساتھ دے۔

رسالہ کی کشتی حیات کو ڈگمگاتے دیکھ کر بعض حضرات کا ماتھا ٹھنکتا ہے اور وہ اس خوف سے خریداری قبول کرنے یا جاری رکھنے سے انکار کرتے ہیں کہ کہیں بند ہو گیا تو ہمارے روپے مارے جائیں گے۔ اپنے عزیز مال کی حفاظت کا طریقہ وہ خود ہی بہتر جانتے ہیں اور انہیں پورا حق حاصل ہے کہ جس طرح چاہیں اس کی حفاظت کریں۔ البتہ ان کی معلومات کے لیے میں صرف اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ رسالہ تجارتی اغراض کے لیے جاری نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایک ایسے مقصد کی خدمت کے لیے جاری کیا گیا ہے جو عین میری زندگی کا مقصد ہے۔ اس لیے جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک میرے ہاتھ پاؤں میں طاقت باقی ہے میں ہر ممکن محنت و کوشش سے انشاءاللہ اس کو جاری رکھوں گا۔ اور بالفرض اگر اس کا جاری رکھنا میری حد امکان سے باہر ہو گیا تو میں ہر شخص کو اس کا پورا پورا حق واپس کر دوں گا۔ میرے اس وعدے پر جس کا جی چاہے اعتماد کرے اور جس کا جی نہ چاہے نہ کرے۔ بہرحال میں اپنی ذمہ داری کو خود محسوس کرتا ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت طاقت نہیں ہے کہ لوگوں کے حقوق کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے دنیا سے آخرت کا سفر کر سکوں۔

میری کتابوں پر "سلسلہ مطبوعات ادارہ دار الاسلام" کے الفاظ دیکھ کر بعض لوگوں کو یہ التباس پیش آ رہا ہے کہ پٹھانکوٹ میں جناب صاحب چودھری نیاز علی خاں صاحب نے دار الاسلام کے نام سے جو ادارہ قائم کر رکھا ہے شاید اس سے ان مطبوعات

کا کوئی تعلق ہوگا۔ رفع التباس کے لیے مجبوراً مجھے اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ یہ ادارہ پٹھان کوٹ والے ادارہ سے بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ اس کے مقاصد، اس کا دستور العمل، اور اس کا دائرہ، سب کچھ اُس سے الگ ہے۔ اس کا عارضی مرکز لاہور ہے، میں اس کا عارضی صدر ہوں، اور اس کے ارکان و معاونین موشئی کے ساتھ اسی دستور العمل پر کاربند ہیں جو دو سال قبل ترجمان القرآن میں شائع کیا گیا تھا۔ البتہ شخصی حیثیت سے میں پٹھان کوٹ والے ادارے کے ٹرسٹیوں میں شامل ہوں اور اس سے میرا اتنا ہی تعلق ہے جتنا دوسرے ٹرسٹیوں کا ہے۔ مجھے ابتدا ہی میں یہ اندیشہ تھا کہ ایک نام کے دو اداروں کے ہونے سے خواہ مخواہ لوگوں کو التباس پیش آئے گا، اسی لیے میں نے چودھری صاحب سے عرض کیا تھا کہ اپنے ادارے کے نام میں کچھ تغیر کر دیں، مگر انہوں نے نام کا تغیر مناسب نہ سمجھا۔ خیر اب مجھے امید ہے کہ اس تصریح کے بعد کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے گی

لاہور سے ایک ہفتہ وار اخبار "اجتماع" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے مالک یا ایڈیٹر صاحب نے اب سے چند مہینے پہلے مجھ سے مضامین کی فرمائش کی تھی، اور میں نے معذرت طلب کرتے ہوئے ان کو اجازت دے دی تھی کہ "ترجمان القرآن" میں میرے جو مضامین شائع ہوتے ہیں ان میں سے جس کو پسند فرمائیں اپنے ہاں نقل کر لیں۔ اس اجازت کو انہوں نے کافی سمجھ کر اخبار کی پیشانی پر میرا نام اس طرح درج فرما دیا کہ گویا مجھے اس کے زمرۂ ادارت میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ لطف یہ ہے کہ مجھے پہلی اشاعت کے سوا ان کے کسی پرچہ کی زیارت تک کا فخر بھی حاصل نہ ہوا۔ میرے متعدد دوستوں نے مجھے توجہ دلائی کہ اس غلط فہمی کو رفع کروں جو اس طرح ایک اخبار کی ذمہ داری میں بلا وجہ شریک کر لیے جانے سے میرے متعلق پیدا ہوتی ہے۔ مگر میں اس امید پر معاملہ کو ٹالتا رہا کہ شاید اس کے ارباب اہتمام کو خود اپنی اخلاقی ذمہ داری کا احساس ہو جائے، یا کم از کم وہ ایک گوشہ نشین گمنام آدمی کے نام کو اپنے لیے غیر مفید پا کر خود ہی چھوڑ دیں۔ افسوس ہے کہ یہ توقع پوری نہ ہوئی! اب میں مجبور ہو کر یہ اعلان کرتا ہوں کہ اس اخبار سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے

مقالات

صلاح و فساد

از جناب محمد زبیر صاحب راز ایم اے

مقامات :-

ا ۔ عیش یا خوشی EPICUREANISM

ب ۔ افادیت UTILITARIANISM

ج ۔ جان اسٹوارٹ مل کا عیش کی نوعیت کا نظریہ QUALITY OF PLEASURE

د ۔ نیکی کا معروضی نظریہ یا خارجی تصوّر OBJECTIVITY OF GOOD

۲ ۔ قرآن حکیم

ا

تم بدی اور غم دونوں سے بھاگتے ہو۔ اس لیے یہ دونوں ہمارے موضوع سے خارج ہوئے بلکہ خوشی اور بھلائی! تم ان دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتے ہو۔ صبح و شام ان کے لیے بیقرار پھرتے ہو پھر اسے کیا کہو گے جو نہیں اُن کے مساکن کو جانے والی سیدھی اور قریب کی راہ سے آشنا کر دے؟

جس منزل کی راہ پوچھتے ہو پہلے اُسے متعین کر لو اس لیے کہ یہ مسافر کا اپنا فرض ہے۔ ہیں

کدھر جاؤں ؟ یہ کسی سے نہیں پوچھا کرتے - جدھر جانا چاہتا ہوں اس کا راستہ کونسا ہے ؟ یہ البتہ پوچھنے کے قابل بات ہے -

۱- کیا خوشی تمہیں دُکھ اور نقصان پہنچاتی ہے ؟ ــــــــ ایسا ہوتا تو تم اُسے ڈھونڈتے کیوں ؟

۲- نقصان نہیں تو کیا فائدہ اور بھلا ہوتا ہے ؟ ــــــــ تیسری تو کوئی صورت ہی نہیں -

۳- خوشی پھر بھلائی ٹھیری - تمہارے لیے سود مند اور بہتر ثابت ہوئی ــــــــ یقیناً تمہاری منزل پھر صرف خوشی ہوئی - خوشی اور بھلائی ، الفاظ دو تھے ، مگر اصل مقصود صرف خوشی نکلی - حقیقتِ حال کا یہ فیصلہ پھر دہرا لو "خوشی میں **نقصان ہوتا تو تم اسے نہ ڈھونڈتے اور نہ قبول کرتے**" زندگی کے سارے ایام تمہارے سامنے کھلے ہیں - انہیں غور سے دیکھ جاؤ - کیا وہ تمہارے اس فیصلہ کی تصدیق کرتے ہیں ؟

بچوں نے اُسے مٹی کے گھروندوں میں ڈھونڈا اور پایا - مگر جب ان کی خوشی کی جگہ بھوک ، رات کی تاریکی اور تکان کی خلش نے لے لی تو وہ گھروں کو پلٹ آئے - اُسی خوشی کو پھر اُنھوں نے کھانے اور سونے میں تلاش کیا - کھانے میں کنین کی تلخی اور بستر پر کانٹوں کی چبھن ہوتی تو وہ نہ کھاتے نہ لیٹتے -

حیوانات کو اسی کی جستجو ہے - ہرن سبزہ زاروں میں چوکڑیاں بھرتا دور نکل گیا ہے مگر اُس کے دل سے پوچھو کہ شکاری کتّوں کا غم آفریں تصوّر بھی اُسے کس قدر بار ہو رہا ہے -

نیک آدمی کو دیکھو وہ اپنی نیک عملی کی زندگی میں لطف اُٹھا رہا ہے اور خوش ہے تو پھر یہ کیوں نہ کہا جائے کہ خوشی ، مسرت ، یا عیش ، نیکی ہے ؟

۳۵۵ ق ۔م میں یونانی حکیم اپیکیورس (EPICURUS) نے حصولِ مسرت کو ہی انسان کے ہر فعل کی غایت الغایات بتایا۔مسرت کا حاصل کرنا، زندگی کو عیش ولذت میں کاٹ دینا اُس کے پیروؤں اور اس کے اپنے نزدیک سب سے بڑی بھلائی ہے۔یہی ایک محور ہے جس کے گرد ہماری ساری زندگی گردش کرتی ہے۔صرف انسان کی نہیں بلکہ حیوان اور دوسری مخلوقات کی بھی۔ایک آرزو ہے جو اس کارخانۂ حیات کو آباد رکھے چلے آرہی ہے، اور وہ صرف لذت کے حصول کی آرزو ہے۔ وہ دلیل لاتے ہیں کہ صرف لذت اور خوشی کے ایک عُنصر کو حیاتِ ارضی سے نکال دو تو زمین پر بسنے والی مخلوقات کی ساری کارگاہیں سرد پڑ جائیں گی۔پس انسان کا فرض صرف ایک ہے اور وہ خوشی کا حاصل کرنا ہے۔خوشی نیکی ہے، بھلائی ہے، پس وہ جس قدر ہو "بے حد" ہو، اچھی ہے۔

اب زندگی کی طرف لوٹو اور دیکھو کہ شواہد و نظائر تمہارے اس فیصلہ کا کہاں تک ساتھ دیتے ہیں۔

۱۔ تمہارے خزانے سونے اور چاندی سے پُر ہیں۔تمہارے ہاں آخرِ عمر میں بچہ پیدا ہوا ہے۔ احباب کی دعوت پر روپیہ صرف کرتے ہو تو خوشی ہوتی ہے۔اپنی نمود خود آپ دیکھتے ہو تو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ تم نے خزانوں کے مُنہ چنانچہ کھول دیئے اور جو تھا لُٹا دیا۔ اب اُسی بستی میں کچکول لے کر گدائی کرتے ہو۔ تو پھر کیا خوشی بھلائی ہے؟

۲۔ عیش پرستیاں تمہیں اتنی دور لے گئی ہیں کہ تم جسمانی طور پر معذور ہو کر اپنی زندگی سے بیزار ہو گئے ہو۔ تو کیا پھر خوشی بھلائی ہے؟

۳۔ سارا گاؤں چوروں کی بستی ہے۔ انہیں چوری میں مسرت حاصل ہوتی ہے۔باہم کسی کو نہیں چھوڑتے کسی کے ہاتھ سے کسی کی عصمت محفوظ نہیں تم بھی چور ہو۔ آج تمہارا سارا اندوختہ بھی

لوٹ لیا گیا اور تمہاری حالت یہ ہے کہ اپاہج اور اندھے ہو چکے ہو چور کو تمہارے گھر سے بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگا ہے۔ مگر تم بتاؤ کہ یہ کارخانۂ حیات کیا مسرت کے محور پر گھوم رہا ہے؟

تم کہو گے نہیں۔ اس لیے زندگی کے مذہب عمل کی تلاش کسی اور گوشہ میں کرنی چاہیئے۔

تمہارا یہ فیصلہ تمہارے جسم وجان کے ایک ایک ریشے کی صدائے حال ہے۔ اور یہ صرف تمہارا اور تمہارے عہد کا فیصلہ ہی نہیں ہے بلکہ آغاز آفرینش سے اب تک افراد اور قومیں اسی ایک نتیجہ پر پہنچتی چلی آئی ہیں۔ اگر تم دور پیچھے ماضی کے تاریک پردوں میں جھانک سکتے ہو تو اقوام عالم کی سرگزشتوں کے سُراغ کو نکلو تم اسی ایک نتیجہ پر پہنچو گے جو تمہارے سامنے مرتب ہو رہا ہے۔ تم ہر عہد میں کتنی ہی ایسی بستیاں پاؤ گے، کتنے ایسے افراد اور کتنی ہی ایسی قومیں دیکھو گے جو عیش وعشرت میں غرق ہیں جن کی زندگیاں صرف عیش پرستیوں کے لیے ہو کر رہ گئی ہیں۔ پھر جب عشرت کی سرمستیاں اُن کے لیے دردناک انجام لے کر آئیں تو شدتِ دہشت وحیرت سے اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور پھر اُن کے لب ودہن سے جو پکار بلند ہوئی وہ اس کے سوائے کچھ نہ تھی "افسوس ہم پر! ہم انجام کی اس ہولناک گھڑی سے غفلت میں رہے، بلکہ ہم خود اپنی جانوں پر ظلم وشرارت کرتے رہے! آخر وہ اپنی بستیاں چھوڑ کر بھاگ گئے:۔

فَلَمَّآ أَحَسُّوا بَأْسَنَآ إِذَا هُم مِّنْهَا يَرْكُضُونَ ۝

"جب ہمارا عذاب انہوں نے محسوس کیا تو دیکھو اچانک وہ بستیوں سے بھاگے جا رہے ہیں

لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوٓا إِلَىٰ مَآ أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُونَ ۝

اب بھاگتے کہاں ہو؟ اپنے اُسی عیش وعشرت کی طرف لوٹو جس نے تمہیں اسقدر سرشار کر رکھا تھا، انہی مکانوں میں واپس جاؤ (جنکی مضبوطی کا تمہیں غرّہ تھا)، شاید وہاں تدبیر ومشورہ میں تمہاری ضرورت ہو اور تم سے کچھ پوچھا جائے!

قَالُوا يَٰوَيْلَنَآ إِنَّا كُنَّا ظَٰلِمِينَ ۝ (الانبیاء: ۱۱، ۱۲، ۱۳)

"انہوں نے کہا ہم پر افسوس ہم ظالم تھے"

اپیکیورس کے پیروؤں نے بھی اسے محسوس کیا۔ چنانچہ وہ ایک قدم اُٹھا کر آگے بڑھے اور کہا کہ زندگی کی تگ ودو کا مرکز ہے تو خوشی ہی مگر اس کی دو صورتوں میں انسان کے لیے امتیاز کرنا لازم ہے۔ پہلی صورت اُن مسرتوں کی ہے جو عارضی ہوتی ہیں، ابھی تھیں اب مٹ گئیں۔ دوسری قسم کی وہ مسرتیں ہیں جو دیرپا ہیں۔ وہ خوشی جو شدید جذبات اور جوش مثلاً عشق اور غصہ کی بندگی سے حاصل ہوتی ہے، پہلی قسم کی عارضی خوشی ہے۔ اس سے روح کو نسبتاً دُکھ زیادہ پہنچ جاتا ہے۔ آرام، سکون، امن، احساسات سے کنارہ گیری، یہ دوسری نوع کی مسرتیں ہیں اور دیرپا ہیں اس لئے بہتر ہیں، ایسی حالت کی چنانچہ تلاش کرنی چاہیے جہاں کوئی چیز کسی حال اور کسی وقت انسان کو رنجیدہ نہ کر سکے۔

اب آؤ اسے ایک نقاد کی نظر سے دیکھیں۔ کیا یہ ایک بن باسی جوگی کی زندگی نہیں ہے جو جہد حیات سے کنارہ کش ہو کر بستی سے دور نکل جائے؟ وہاں بھی اُسے اگر صبح وشام کے کھانے کی فکر رنجیدہ کرتی ہو، وہاں بھی اگر درندوں سے اُس کا دل دہلتا ہو، تو وہ اس کے سوا اور کیا چارۂ کار پائے گا کہ زمین وآسمان کے درمیان کوئی مسکن تلاش کرے یا خودکشی کر لے۔ کیونکہ بن باسی کی زندگی بھی اس کے موافق نہیں بیٹھتی۔ چنانچہ اپیکیورس کے پیروؤں کا ایک فرقہ اس طرف گیا ہے کہ خودکشی بہترین بھلائی ہے اور جو انتہائی مسرت چاہے وہ اپنے حلقوم پر چھری رکھے اور خودکشی کر لے تاریخ نے اس گروہ کے خودکشی کرنے والوں کے نام محفوظ رکھے ہیں۔ تو پھر کیا خوشی کے حصول کے گرد انسان کی زندگی اور زندگی کے جملہ مطالبات اور فرائض کو مرتب کیا جا سکتا ہے؟ ——— ظاہر ہے کہ نہیں۔

ب

افلاطون نے تھیئیٹس (THEAETUS) میں ثابت کیا ہے کہ اگر عقل سے الگ ہو کر کوئی مسرت کا تعاقب کرنا چاہے گا تو ٹوٹے میں رہے گا اور اُسے نہیں پائے گا عقل اور فہم سے الگ ہو جانا اس کے نزدیک ایک ہی وقت میں اپنے حافظہ سے الگ ہو جانا ہے مستقبل اور ماضی سے کٹ جانا ہے۔ نہ مستقبل کی خوشیوں کا انتظار اور تیاری، نہ ماضی کی خوشیوں کی یاد اور لذت، بھلا جو عقل کو تیاگ کر خوش رہنا چاہے وہ سوچے گا کیوں؟ کل وہ اسی ماں کا بیٹا تھا۔ وہ اسے یاد رکھے تو کیوں؟ اس کے فرائض کو ادا کرے تو کیوں؟

افلاطون کا مقام اسی حکیم کے قریب نظر آتا ہے، اس نے کہا:۔

سچی اور جھوٹی خوشی میں امتیاز کرو۔

آسودہ اور پاک خوشی میں فرق کرو۔

شریف اور وضیع میں فرق جانو۔

افلاطون کے نتائجِ فکر سے آگے بینتھم (JEREMY BENTHAM 1748-1852) کی کرید شروع ہوتی ہے۔ اس نے ریاضی کے ٹھوس اور محسوس اصول پر مسرت کے اس فلسفہ کو تحویل کیا اور یوں اس کی ایک عملی صورت نکالی۔ اس کی تفصیل کو سمجھ لو۔

ہمارے سامنے مسرت انگیز مشاغل کی ایک فہرست آگئی ہے۔ جوانی کی اٹھان اور جذبات کے طوفان کا مطالبہ یہ ہے کہ ساری عشرتیں اپنے دامن میں لپیٹ لی جائیں۔ اور دل نے یہ کہہ دیا ہے کہ لطف اندوزی ہی جب مدعاءِ حیات ہے تو یکبارگی ایک ہی فرصت میں سب کو دیوانہ وار شروع کر دیا جائے۔ مگر افلاطون نے متنبہ کر دیا ہے کہ یوں عقل و فہم سے جدا ہو کر خوشی کے تعاقب میں نکلو گے تو گھاٹے میں رہو گے۔ اس لیے تمہارا طریق کار یہ ہونا چاہیے کہ ساری فہرست میں سے پسندیدہ خوشی کا انتخاب کر لو۔ اب سوال یہ ہوا کہ یہ کیسے کریں؟

بینتھم کہتا ہے کہ جس طرح تم ریاضی کے اعداد کو جمع کر لیتے ہو اور پھر ایک صحیح نتیجہ اخذ کر کے مطمئن ہو جاتے ہو، ٹھیک اسی طرح پر جتنی مسرتیں تمہیں اپنی طرف بلا رہی ہیں اُن پر ذیل کے چار گوشوں سے نگاہ ڈالو اور نتائج کو ایک جگہ جمع کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ انہوں نے تمہیں بُلایا اور تم دیوانے ہو کر دوڑ گئے۔

چار گوشے :۔

۱۔ کیا اس کام سے یقینی طور پر خوشی حاصل ہوگی یا یہ غیر یقینی آرزو ہے ؟

۲۔ کیا یہ خوشی جو حاصل ہونے والی ہے غم کی ہر ممکن آلودگی سے پاک اور صاف ہے؟ یعنی اس میں کوئی ایسا پہلو تو نہیں جو سامنے آکر ہماری عشرت کو مکدر کر دے ؟

۳۔ کیا یہ دیر پا ہوگی یا جلدی مٹ جانے والی ہے ؟

۴۔ حاصل ہونے والی خوشی کی مقدار کس قدر ہے؟ بے کراں ہے یا تھوڑی سی ؟

اب اگر اس تحقیق کے نتائج کا مطالبہ تمہارے حق میں ہے تو بس جو بھی عشرت تمہارے سامنے آگئی ہے گزرو، وہ تمہارے لیے بھلائی ہے۔ اپنی اس شکل میں زندگی کا یہ افادی نظریہ ہے (PHILOSOPHY OF UTILITY)۔ کام صرف وہ کرو جس میں سب سے کم زحمت اٹھانی پڑے اور سب سے زیادہ عیش کی مقدار ملے۔ یہی نیکی ہے۔ یعنی نیکی تمہارا ایک ذاتی اور انفرادی انتخاب ہے۔ تمہارا ذاتی رجحان ہے۔ اصطلاحی زبان میں نیکی کی حیثیت موضوعی یا داخلی (SUBJECTIVE POSITION) ہے۔ تمہارے اپنے اندر کی آواز اور ذاتی میلان کے ماتحت اس کی شکل بدلتی رہتی ہے۔

ابھی یہ مقام اپنی پوری کیفیت اور مطالبات کی رو سے شاید واضح نہ ہُوا ہو اس لیے رک جاؤ تاکہ اسے کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیا جائے۔ چند سطور پیچھے لوٹ کر پھر بینتھم کے ان چار معیاری اصولوں پر پہنچ جاؤ۔ وہ یہ ہیں :۔

۱۔ خوشی یقینی ہے یا غیر یقینی ؟

۲۔ اس میں غم کی کوئی آلودگی تو نہیں ؟

۳۔ وہ دیرپا ہے یا عارضی ؟

۴۔ زیادہ ہے یا تھوڑی ؟

اب انہی معیاروں کو سامنے رکھ کر دیکھو۔ ایک عورت بادشاہ وقت کی بیوی ہے۔ جوان ہے۔ نہایت خوبصورت ہے۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہیں۔ وہ اپنے غلام پہ عاشق ہو جاتی ہے۔ اپنے عظیم الشان محل کے ایک ایسے اندرونی حصہ میں جہاں کسی راز کے کھلنے کا اندیشہ نہیں اس غلام کو طلب کرتی ہے اور اپنے مطالبات جنسی اس کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ دولت، حسن، جوانی، اور عیش جاودانی سب اس غلام کے قدموں میں ہیں اور ملکہ کی شیفتگی، اس کی دانشمندی اور اس کا اپنا مفاد، ہر چیز اس امر کی ضمانت دے رہی ہے کہ اس کا مطالبہ قبول کر لینے میں غلام کے لئے مزے ہی مزے ہیں۔

اب غور کرو۔ (۱) غلام کے لئے خوشی یقینی ہے۔ کسی شک کی اس میں گنجائش ہی نہیں۔ (۲) اس عیش میں غم کی کوئی آلودگی نہیں۔ وہ ملکہ کی حفاظت میں ہے اور ملکہ کا اپنا مفاد یہ چاہتا ہے کہ راز کھلنے نہ پائے۔ البتہ اس کی خواہش رد کر دینے میں جان تک کا خطرہ ہے۔ (۳) ملکہ اس پہ بڑا جان سے فدا ہے، اس لیے یقینی ہے کہ جیتے جی غلام کے پاؤں دھو دھو کر پیتی رہے گی۔ (۴) خوشی کی مقدار بے حد و حساب ہے۔ ایک غلام اور ملکۂ وقت اس کے قابو میں ہو۔ مال بھی، جمال بھی، عیش و محبت بھی، اور حکومت و اقتدار بھی۔ اس خوشی میں آخر کس چیز کی کمی ہے۔

دیکھو چاروں معیار پورے ہو رہے ہیں۔ بینتھم کی افادیت کا صاف صاف مشورہ یہ ہے کہ غلام کو اپنے جسم و جان کی پوری قوت کے ساتھ، اپنے دامن طلب کو پورا پھیلا کر اس خوشی کو سمیٹ لینا چاہیئے۔ نادان ہوگا اگر اس موقع کو ہاتھ سے دے گا۔

بینتھم کے نزدیک ایسی خوشیاں نیکیاں ہیں اور ابن آدم پر ان کی تلاش فرض ہو چکی ہے۔

جو مثال ہم نے دی ہے اس نوعیت کی مثالیں عام نہیں تو نہ ہوں، نایاب نہیں ہیں۔ کیا ایک چور کو ایسے مواقع ہم نہیں پہنچ سکتے جن میں بینتھم کے چاروں معیار پورے ہوتے ہوں؟ کیا بہت سے رشوت خوار حاکم ہماری آنکھوں کے سامنے یقینی، بے غم، دیرپا اور بے حساب خوشی جمع نہیں کر رہے ہیں؟

یہ ہمیں ماننا پڑے گا کہ اپیکیورس کے اندھے عیش پرست سے افلاطون اور بینتھم کا دانا عیش پرست بہتر ہے جو چوری، زنا اور جھوٹ کا مرتکب ہونے سے پہلے موقع دیکھ لیتا ہے۔ مگر جس بات پر دونوں متفق ہیں وہ یہ ہے کہ انسان کے لئے اُس کی اپنی انفرادی صواب دید سے الگ نیکی کا کوئی دستور نہیں۔ جسے تم اچھائی سمجھتے ہو لازم نہیں کہ تمہارے دوست بھی سمجھیں، لازم نہیں کہ تمہاری نیکی سماج کے لیے بھی نیکی ہو۔

بینتھم کا پیرو رحمدل ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ دانا ہے اور افادیت کا مطالبہ یہ ہے کہ جب کل اُس پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹے گا تو کوئی اُس پر رحم کرے گا۔ وہ تمہارا دوست ہو سکتا ہے، مگر اس امید پر کہ جب وہ آلام میں گھر جائے گا تو تم دوستی کرو گے۔ وہ اپنا عہد اس لیے استوار رکھتا ہے کہ دوسرے اس سے بدعہدی نہ کریں۔

اس قسم کی سیرت کیا انسان کے لیے موزون ہے؟ تم پکار اُٹھو گے کہ نہیں۔ اخلاقیات کے منکرین بھی تمہارے ساتھ ہمزبان ہیں، مگر وہ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔

پہلا گروہ جان اسٹوارٹ مل (JOHN STUART MILL) کا پیرو ہے جس نے خوشی کی نوعیت کو انتخاب و عمل کا معیار قرار دیا۔

دوسرا گروہ کانٹ (KANT) کی سرکردگی میں نکلتا ہے اور نیکی کا ایک خارجی یا معروضی وجود

(OBJECTIVE ENTITY OF GOOD) تسلیم کرتا ہے۔ کلیسائی مفکّرین کی حمایت اس کے ساتھ ہے۔

ج

جان سٹوارٹ مل کہتا ہے کہ تم اپنی تاجرانہ زندگی کے پورے پھیلاؤ کو اگر غور سے دیکھ سکو تو تمہیں نظر آئے گا کہ اس میں تم بنتھم کی طرح صرف یہ نہیں دیکھتے کہ تم اپنے داموں سے زیادہ سے زیادہ کون سا سامان خرید سکتے ہو۔ بلکہ تم یہ بھی سوچتے ہو کہ سامان تھوڑا ہو تو ہو مگر بذات خود اچھا ہو تم صرف (QUANTITY) کمیت ہی نہیں بلکہ کیفیت (QUALITY) بھی دیکھتے ہو۔ لہٰذا بنتھم نے ہمیں جو یہ بتایا تھا کہ نتائج کو جمع کر لو اور پھر تعداد دیکھ لو کہ وہ کم تو نہیں، مسرت کے انتخاب کا یہ طریقہ صحیح نہ ہوا۔ بلکہ صحیح یہ ہوا کہ مسرت کی مقدار کم ہو تو ہو مگر اس کی نوعیت و کیفیت اچھی ہو۔ نہایت ہی اچھی نوعیت کی خوشی ایک لمحہ کے لیے ملتی ہے تو لے لو۔ بُری قسم کی خوشی ایک سال کے لیے میسر آتی ہے تو چھوڑ دو۔

خوشی کی نوعیت کا اب کیسے پتہ چلے؟ کیسے یقین آئے کہ فلاں عیش گو مقدار میں تھوڑا ہے مگر مقابلتہً اعلٰی قسم کا ہے؟ خود سٹوارٹ مل سے یہ سوال کیا گیا۔ اُس نے کہا میرے نزدیک اس کا جواب صرف ایک ہے۔ خوشی کے کوئی سے دو کاموں میں سے نوعیت میں اچھا وہ ہوگا جسے سب یا قریباً سب اچھا سمجھیں۔ بشرطیکہ وہ ان دونوں کو تجربۃً دیکھ چکے ہوں، اور ہر مجلسی دباؤ سے بے نیاز ہو کر اس کے بارے میں رائے دے رہے ہوں۔ اب اگر اُس کی راہ کٹھن بھی ہوگی تو میں اُسے اختیار کر لوں گا۔ مثلاً

ایک بنیا کہتا ہے کہ افسانہ نگاری میں کیا دھرا ہے۔

ایک پہلوان کا خیال ہے کہ شاعری کے مقابلہ میں کشتی لڑنے میں زیادہ مسرت اور زیادہ عیش ہے مل کہتا ہے میں ان دونوں کی شہادت کو معتبر نہیں سمجھوں گا کیونکہ شاعری اور افسانہ نگاری کے عیش پر تبصرہ کرنے کے لیے بنیا اور پہلوان کسی طرح بھی موزوں اشخاص نہیں ہو سکتے۔

اب آگے بڑھے تو ایک زاھد بڑ سے کہہ رہا تھا کہ "شراب بُری چیز ہے"۔ پاس سے ایک رند خراباتی پکار اُٹھا "ہائے کم بخت تُو نے پی ہی نہیں"۔ اب بڑ کیسے تسلیم کرے گا، بات ضغطہ میں پڑگئی۔ جہاں تک شراب کی قصیدہ گوئی کا تعلق ہے کون ہے جو اُردو اور فارسی شاعری کی شہادتیں صفحۂ ہستی سے مٹا سکے۔

در عہد تنگ دستی در بادہ کوش و مستی کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را حافظ

اور اُردو نے تو مہر لگادی کہ خواہ تصوف کے مسائل ہی بیان کیوں نہ کرنے ہوں۔ ساغر و مینا کے بغیر بات نہیں بنتی۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر غالب

سبحان اللہ بادہ و ساغر کے الفاظ میں کس قدر شیرینی ہے کہ "غالب کے ہمعصر" یا "ہندوستان کے بسنے والے" کسی اور چیز کا نام تک سُننا گوارا نہیں کرتے۔ بلکہ ذرا آگے چل کر دیکھیو۔ وہی انسان جس کا فتوےٰ یہ تھا کہ شراب "قاروں کند گدارا" وہ بوڑھا ہو کر ایک دوسرا ہی مشورہ دے رہا ہے۔

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں آ رندی و خراباتی در عہدِ شباب اولیٰ

اب تم اُس کا کونسا مشورہ قبول کرو گے؟ پہلا یا دوسرا؟ کیا دوسرا؟ کیوں؟ تم کہو گے "اس نے یہ طویل تجربہ کے بعد کہا"، مگر شراب پر رائے رکھنے کے لئے "پیری" ہی کیوں مناسب سمجھی جائے؟ یہ عہد تو وہ ہے جب عہد شباب اور یوں کہو کہ زندگی کی ساری صلاحیتیں چھوڑ کر رخصت ہوتی ہیں اور تم جوان ہو۔ پھر بڑھاپے کی رائے کیوں قبول کرنے لگے؟

کیا بڑ نے نوعیتِ عیش کی تلاش کا یہ طریق مقرر کر کے ٹھوکر نہیں کھائی؟ "عیش کی نوعیت"! نکتہ تو خوب تھا مگر وہ خود اس کی بلندیوں کا ساتھ نہ دے سکا۔

فلاسفہ کا ایک دوسرا گروہ اب کانٹ کی سرکردگی میں آگے بڑھتا ہے۔ کلیسائی مفکرین اس کے جلو میں ہیں۔ نتائج کے "الحاد" کا کھوج لگاتے ہوئے وہ اُس چشمۂ فکر تک پہنچے جہاں سے اس پہلے گروہ کے جملہ افکار سیرابی حاصل کرتے تھے۔ انہوں نے کہا غلطی فروعات میں نہیں اصل میں ہے۔ دلائل کے درخت کی ٹہنیوں اور پتوں میں نہیں بلکہ جڑ میں ہے۔ یہ کہنا کہ خوشی نیکی یا بھلائی ہے یہی بنیادی لغزش ہے۔ نیک عملی کی زندگی میں اکثر و بیشتر ایسے مواقع آجاتے ہیں جن کی راہ ماتم دکھ اور مصائب کے کانٹوں سے پُر ہوتی ہے۔ مثلاً تحفظِ وطن کے لیے غازی اژدر دم توپوں کے سامنے جا رہا ہے۔ وقت کے جابر ہاتھ سچ کہنے والی زبان کو گدی سے کھنچوا رہے ہیں گو نیکی کی راہ چلنے والوں کو بعض اوقات خوشی بھی نصیب ہو جاتی ہے مگر نیکی اور خوشی لازم ملزوم نہیں۔ اس لیے خوشی کو بھلائی قرار دینا فیصلہ کی غلطی ہے۔

اچھا، مان لیا کہ خوشی نیکی نہیں ہے۔ پھر نیکی آخر ہے کیا چیز؟ یہ مصلحین، کانٹ اور اس کے پیرو جواب دیتے ہیں "وہ ایک فعل ہے جس میں خود اپنا حسن ہوتا ہے"۔ ہمیں اسے کیوں اختیار کرنا چاہیے؟ وہ کہتے ہیں "نیکی کو ہمیں اُس کے اپنے حسن کے لیے اختیار کرنا چاہیے"۔ صداقت اور حسن بذات خود بھلے ہیں۔ زنا بذاتہٖ برائی ہے۔ یعنی نیکی اپنے الگ وجود کے ساتھ قائم ہے۔ (OBJECTIVE EXISTENCE OF GOOD)۔ وہ محاسن کی ایک فہرست ہے۔ اخلاق کا ایک ضابطہ ہے جس پر تمہیں چلنا ہے عیش نہیں بلکہ یہ ضابطۂ حیات زندگی کا محور ہے۔ اس ضابطہ کی زندگی کو کانٹ (FORMALISM) کہتا ہے۔

کانٹ نے نیکی کا جو تصور ہمارے سامنے رکھا ہے۔ وہ اپنے اجمال میں یہ ہوا۔

(الف) نیکی کا ایک خارجی وجود ہے۔

(ب) خوشی اور نیکی لازم ملزوم نہیں۔ نیکی کو ہم اُس کے نیک وجود کے لئے پسند کرتے ہیں، خوشی

کی غرض سے نہیں کرتے۔

نیکی کا اگر کوئی ایسا خارجی و معروضی ضابطہ ہے جسے انسانی فطرت تعمیر نہیں کرتی اور جس کی پیروی میں یہ بھی لازم نہیں کہ انسان کو خوشی نصیب ہو، تو پھر اُس کا مُصنّف کون ہے؟ ماضی یا حال کے انسانی تجربات کو اگر اُس کا مُصنّف کہا گیا تو یہ انسان کا ایک ذاتی و داخلی فعل ہو جائے گا۔ خارجی و معروضی نہ رہے گا مفکّرین کی پہلی جماعت نے بھی تو یہی کہا تھا۔ انہوں نے بھی تو خود انسان کے اندر پیدا ہونے والے ایک جذبہ یا روشنی کو اس کے لئے کافی سمجھا تھا۔ اب دونوں میں اختلاف کونسا رہ گیا؟ کیا صرف یہی کہ مصلحین کے پہلے گروہ نے انسان کے دو اصولی جذبات غم اور خوشی میں سے خوشی کو اپنی جانوں کے لیے بہتر سمجھا؟ کیا وہ غم اور دُکھ کو انتخاب کرتے؟ وہ ایسا کیوں کرتے؟ انسان نے اپنی ساری سرگزشت میں کہیں بھی اور کبھی بھی تو ایسا نہیں کیا۔

یہ استدلال ایک دوسرے گوشے کو بھی بے نقاب کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ غم کو انسان طبعاً پسند نہیں کرتا، رہ گئی خوشی تو خوشی کا انتخاب کانٹ کی نگاہ میں بُرائی ہے یعنی انسان کو اس کی جبلت پر نہیں چھوڑا جاسکتا، اس کی فطری روشنی پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

کلیسائی مفکّرین بھی اس کے ساتھ آواز ملاتے ہیں کہ ہاں نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اس لیے کہ وہ انسانی فطرت کو اعتماد کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اُن کا خیال ہے کہ انسان کی سرشت میں گُناہ ہے۔ سولھویں صدی مسیحی تک ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا صرف یہی ایک تعلیم مرکز بنی رہی سینٹ پال کی طرف جو ابنیتِ مسیحؑ کی تعلیم منسوب کی جاتی ہے اس کی تمام تر بنیاد صرف اسی ایک خیال پر رکھی گئی تھی۔ اس کلیسائی تعلیم کے نفوذ کا یہ عالم ہے کہ ہل (خوشی کے فلسفہ کا داعی) جب خوشی میں "نوعیت" کا عنصر پیدا کرنا چاہتا ہے تو اُسے انسانی فطرت میں کوئی صلاحیت نظر نہیں آتی۔ وہ بھی انسانی سرشت کے گناہ سے اس درجہ خائف ہے کہ وہ یہ نہ کہہ سکا کہ انسان خود اپنی فطرت کی پیروی

کرتے ہوئے بھی بھلائی کو پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ وہ دلائل کے مواخذہ سے دامن بچا کر گزرنا چاہتا ہے۔ اور صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ کہ

MANY STOIC AS WELL AS CHRISTIAN ELEMENTS SHOULD BE INTRODUCED IN MORALITY

"ہمیں اخلاقیات میں رواقی اور عیسائی عناصر کو شامل کر لینا چاہیے"

ظاہر ہے کہ یہ الفاظ اس کی معذوری کے آئینہ دار ہیں۔ یہاں دلیل اس کی معاونت نہیں کر رہی ہے۔

کلیسا نے الہام کو نیکی کا خارجی مصنف کہا (اسلام میں الہام کا تصور بالکل جداگانہ ہے اور وہ اپنے مقام پر بسط سے آئے گا) اور اس سے نیکی کا یہ معروضی تصور قائم ہوا۔ مگر اس تصور کو سترھویں صدی مسیحی میں ایک آخری مہلک ضرب پہنچی عیسائی مبشرین نے دور دست جزائر میں سفر کیے۔ زمین کے ایسے کونوں تک پہنچے جہاں ابنیت مسیح اور کفارہ کی کوئی آواز نہ پہنچی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں کے بسنے والے اخلاق کے نہایت بلند اصول پر کاربند تھے۔ آخر کار ان ہی سیاحتوں کی بدولت "نیک سیرت وحشی" (VIRTUOUS SAVAGE) کی نوع کی اصطلاحات وضع ہوئیں۔

فیصلہ طلب امر اب صرف یہ رہ گیا کہ فطرت انسانیہ کا مطالعہ کرتے ہوئے خوشی کے مصنفین نے ٹھوکر کہاں کھائی اور حقیقت کہاں چھپی ہے؟

۳

جب نباتات اور حیوانات اپنی فطری استعداد کی حدود میں نہایت صلاحیت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور انہیں کسی بیرونی یا انسانی ضابطہ اخلاق کی ضرورت پیش نہیں آتی تو پھر کیا یہ صرف انسان ہی ہے جس کے لیے اس کی اپنی فطرت میں کوئی راہنمائی موجود نہیں؟ یقیناً یہ انسان نہیں بلکہ جمادات

کی کوئی لایعنی شکل ہوگی جس کی زندگی کی عنان تم اُس کی اپنی فطرت کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے گھبراتے ہو۔ انسانی اخلاق کا اصلِ کار یا مذہب عمل دوسری جملہ مخلوقات کی طرح اس کی اپنی سرشت ہی میں تلاش کرنا چاہیے۔ اپیکیورس کے نظریہ، یعنی نیکی کے موضوعی تخیل میں صحیح صرف اس قدر ہے کہ تلاش صحیح گوشہ میں کی گئی مگر خامی یہ رہی کہ تلاش کے صرف چند قدم اُٹھا کر ڈھونڈنے والوں نے دم ہار دیا جو نشانِ منزل تھا اُسے وہ منزل سمجھے اور پھر وہیں بیٹھ گئے۔ وہ معلوم نہ کر سکے کہ اس کی تنقیص سے روشنی آگے بڑھتی ہے۔ چنانچہ ضابطہ کے مفکرین (FORMALISTS) نے زندگی کے شواہد سے یہ ثابت کر دیا کہ کوئی ایک شخص ہو یا ایک پوری جماعت عیش طلبی کے جذبات میں گم ہو کر پنپ نہیں سکتی۔ اس کی زندگی میں بناؤ کی جگہ بگاڑ کے آثار ابھر کر سامنے آجائیں گے تعمیر، قیام اور صلاح کی لطف اندوزیوں کی بجائے زوال، فساد اور فنا سے دوچار ہونا پڑے گا۔

مدنیت کی پہلی اینٹ ماں ہے۔ انسانی تہذیب کی اس سے زیادہ ابتدائی کوئی صورت ذہن میں نہیں آسکے گی کہ کسی جنگل کے ایک گوشے میں ایک ماں ہو اور اُس کی گود میں ایک بچہ ہو جسے وہ جنگل کے وحشی درندوں سے چھپائے پھرتی ہو۔ حفظ نسل کا یہ پہلا درس ہے جو بچے نے ماں کی گود سے سیکھا۔

عقاب کو بچوں پر لپکتے دیکھ کر ماں نے انہیں سینہ سے چمٹا لیا۔ اور پھر ظلم کی جابر طاقتوں کو روکنے کے لیے اس نے اپنے کمزور اور ناتواں بازوؤں کو پھیلا دیا۔ یہ تو اکثر ہوتا رہا کہ حملہ آور نے اُسے مہلک زخم پہنچائے مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ ماں نے بچوں کو بچانے کے لئے خود موت کے منہ میں جانا قبول نہ کر لیا ہو۔ نسل کو بچانے کے لیے خود اپنی جان پر کھیل جانے کا یہ دوسرا سبق بھی انسان کو ماں کی گود نے دیا۔

چنانچہ بچہ جوان ہوا تو اس نے اسی آئین پر اپنی ماں اور بہن بھائیوں کی نگہداشت کی۔

(۱) انسان جب اپنے اعمال کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کے قیام و بقاء کا باعث ثابت ہو رہے

ہیں تو اس کے دل و دماغ جس جذبہ سے اپنی لپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں وہ خوشی ہے ۔ **خوشی پھر فعل نہیں فعل کا نتیجہ ہوئی ۔**

(۲) اور جب اُسے یہ نظر آتا ہے کہ اُس کے اعمال اس کے بہن بھائیوں اور دوسرے اقارب کے لیے باعثِ صلاح اور باعثِ قیام ثابت ہو رہے ہیں تو وہ انہیں اور بھی زیادہ لپسندیدگی سے دیکھتا ہے ۔ مدنیت کا یہ دوسرا بلند تر درجہ ہے ۔

اور اس دوسرے مقام پر کنارِ مادر نے اُسے یہ درس دیا ہے ۔ کہ جو بیلے لُٹا دے اور پھر خوش ہو ۔ صبح و شام کی محنتِ شاقہ اور میدانِ جنگ میں خون کے چھینٹے ان سب میں خوشی کے چشمے اُبل رہے ہیں ۔ مسٹر چرچل برطانیہ کے وزیرِ اعظم نے ابھی کل ہی کہا کہ ہم اپنے بچوں کے لیے لڑ رہے ہیں ۔ حفظِ نفس کی اسی خواہش بلکہ ضرورت نے اعمال کی لمبی تاریخ مرتب کر دی ۔ اور وہ قبیلہ، ملک اور قوم کے مدارج تک آپہنچی ۔ قرآن نے اسے ملک اور قوم کی حدود سے اچھالا اور وہ انسانیت کی بیکرانیوں سے ہمکنار ہو گئی ۔[1]

---

[1] فاضل مقالہ نگار کے بیان سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ حفظِ نفس اور حفظِ نوع کا جذبہ جو حیوان اور انسان کی جبلت میں ودیعت کیا ہوا ہے وہی قانونِ صلاح و فساد کا مدار ہے اور قرآن نے اسی پر اپنے اخلاقیات کی بنیاد رکھی ہے ۔ اگر ان کا خیال یہی ہے تو یہ کسی طرح صحیح نہیں ۔ یہ دراصل مغربی اہلِ فکر کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک ہے کہ وہ انسان کو حیوان سے زائد کچھ نہیں سمجھتے اور اسی لیے انسان کے مذہبِ عمل کے مبادی حیوانی زندگی کے قوانین میں تلاش کرتے ہیں ۔ حالانکہ انسان من حیث الانسان ہرگز حیوان نہیں ہے ۔ اس کو آلہ اور سواری کے طور پر حیوانی جسم ضرور دیا گیا ہے لیکن وہ بجائے خود حیوان نہیں ۔ اگر وہ حیوان ہوتا تو سرے سے اخلاق کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ۔ اخلاق کا سوال صرف اختیار (FREE - WILL) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے ۔ حیوان، جماد، نبات وغیرہ ذی اختیار مخلوق نہیں ہیں بلکہ قوانینِ طبعی سے کلیتہً مقہور ہیں اور ان کا بناؤ اور بگاڑ ایسی قوتوں کے عمل سے ہو رہا ہے جن میں وہ اپنا آزادانہ انتخاب کہیں استعمال نہیں کرتے ، اس لیے وہ اخلاقی وجود نہیں ہیں ۔ برعکس اس کے انسان کو ایک خاص حد کے اندر اختیار دیا گیا ہے اور اس کے صلاح و فساد کا سررشتہ تمام تر طبعیت کی جابر قوتوں ہی کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک اس کے اپنے آزادانہ انتخاب پر منحصر ہے اس لیے وہ ایک اخلاقی وجود ہے اور اس

(باقی بر صفحہ ۳۵۹)

ہر وہ فعل جس کا رخ انسانی صلاح و فلاح کی طرف ہو وہ اچھا ہے، خیر اور نیکی ہے، اور وہی حقیقی خوشی کا باعث بھی ہے۔ اور ہر وہ فعل جس کا رُخ تعمیر کی بجائے تخریب، قیام حیات کی بجائے فنا اور صلاح کی بجائے فساد کی طرف ہو جائے وہ بُرا ہے، بدی اور شر ہے، اور وہی باعث غم بھی ہے[1]۔

انسان کے تجربات کی بہت لمبی فہرست اس زمین کے کونوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن کہتا ہے، کہ انسان اس لمبی زندگی میں ہر فعل کو آزما چکا ہے۔ ہر لغزش کی سزا اور ہر استواری کا انعام حاصل کر چکا ہے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۳۵۸) بنا پر اس کی حیثیت تمام مخلوقات سے بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔ قرآن سب سے پہلے انسان کی اسی امتیازی حیثیت کو نمایاں کرتا ہے۔ پھر وہ انسان کو بتاتا ہے کہ تیری فلاح اور تیرا خسران نیز بننا اور بگڑنا منحصر ہے اس پر کہ تو اپنے اس اختیار کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ انسانی سعی کے دو راستوں کو واضح اور روشن فرق کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ایک یہ کہ آدمی اپنی مختاری سے دھوکا کھا کر اپنے آپ کو خود مختار و غیر ذمہ دار سمجھ لے اور اپنی حیوانی جبلت کو اپنا پیشوا و رہنما بنا کر اس کے پیچھے چلنے لگے، اور محض قوانین طبعی (PHYSICAL LAWS) سے اپنی زندگی کا ضابطہ اخذ کر کے صرف اس دُنیا کی کامیابیوں کے لیے اپنی مساعی وقف کر دے۔ یہ روش چونکہ فطرت کائنات اور فطرت انسانی دونوں کے خلاف ہے، نہ اس کائنات کا نظام اس طور پر بنا ہے کہ یہاں کسی کو خود مختاری کا حق ہو اور نہ انسان کی فطرت اس طور پر بنی ہے کہ وہ نرا حیوان بن کر محض قوانین طبعی پر چلے اس لیے اس کا آخری نتیجہ فساد ہے، بگڑنا اور ٹوٹ جانا ہے، تباہی و خسران ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان اس کائنات کے حکمراں اور خود اپنے صانع کو اپنا حکمراں سمجھے، اور اس کے دیئے ہوئے اخلاقی قانون (MORAL LAWS) کی پیروی کرے اور اس کے سامنے اپنی جواب دہی کا خیال رکھ کر اس کی رضا کے لیے سعی کرے۔ یہ روش چونکہ فطرت کائنات اور فطرت انسانی کے مطابق ہے اس لئے اس کا آخری نتیجہ صلاح ہے، بننا اور ترقی کرنا ہے، فوز اور فلاح ہے۔ فاما من طغیٰ و آثر الحیوٰۃ الدنیا فان الجحیم ھی الماویٰ۔ واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھویٰ فان الجنۃ ھی الماویٰ۔ ترجمان القرآن

[1] ترجمان القرآن۔ یہ بات اصل حقیقت کے بر عکس ہے۔ دراصل خیر وہ ہے جو انسان کے بنانے والے کے منشاء کے مطابق ہو اور اس کا نتیجہ صلاح ہے۔ اور شر وہ ہے جو اس کے منشاء کے خلاف ہو اور اس کا نتیجہ فساد ہے۔

پھر ان وارداتِ حیات کو آنکھ کھول کر دیکھو اور پھر انھی زلات کا ارتکاب نہ کرو۔ **قرآن کا عمرانی پیغام وسیع معنوں میں تاریخی استنباط کا پیغام ہے۔**[1]

انسان کی رہنمائی کا سارا بوجھ اس کی اپنی فطرت پر ہے۔ یہ تو ہوتا رہا کہ انسان نے ہر لغزش پہ بہت بڑی انفرادی اور اجتماعی عقوبتیں برداشت کیں۔ مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ نوع انسان کا پورا کارواں حیات کسی لغزش کی ایسی گھاٹی میں کھو جاتا کہ مٹ جاتا۔ اس کی زندگی راہ کے پیچ و خم کو طے کرتی ہوئی برابر بڑھتی آ رہی ہے اور ارتقائی منازل کا عزم کیے ہوئے ہے۔

وقت آ گیا ہے کہ تمہیں بتا دیں کہ خوشی کا مسکن کہاں ہے۔ تم اُسے ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ اُن اعمال کا نتیجہ ہے جو موجبِ صلاح ہوں۔ اُن کو معلوم کر لو۔ اُسے پا لوگے۔ ان اعمال کو انسان کے خود اپنے تجربات کی تائید حاصل ہے۔ نیکی انسان کا داخلی اور موضوعی رجحان ہے۔ یہ کوئی معروضی حیثیت کی چیز نہیں کہ تمہیں اس کی تلاش کے لئے کہیں باہر سفر کرنا پڑے۔

قرآن انسان کی فطرت کو کامل اعتماد اور بھروسہ کی نظر سے دیکھتا ہے:-

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (الروم-۳۰)

"پھر تو یکسو ہو کر اپنے آپ کو دین پر جما دے۔ اللہ کی فطرت (ساخت) پر قائم ہو جا جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ یہی سیدھی روش ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے"

دیگر مطالب سے کٹ کر صرف اس مقام کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن حکیم امور ذیل کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہے:-

(۱) ایک مقرر دین (راہ) پہ آ جاؤ۔

---

[1] ترجمان القرآن۔ اس بیان میں بھی غلطی ہے اور اس کو ہم نے آگے ایک دوسرے حاشیہ میں واضح کر دیا ہے۔

(۲) وہی ایک راہ ہے جو انسان کی فطرت کی راہ ہے۔ انسان جا ہی اسی پر سکتا ہے۔ یہ اس لیے کہ دائیں بائیں متوجہ ہونا اُس کے لیے باعثِ ہلاکت ثابت ہوا، ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔[لہ]

(۳) اسی پر انسان کی فطرت کو تعمیر کیا۔ یہ سیدھی راہ ہے۔ اُس کی ساخت کو ادھورا نہیں چھوڑا کہ وہ کسی معروضی یا باہر کی ہدایت کا امیدوار رہے[کہ]۔ اسی پر چلتے جانا بھلائی ہے۔

لہ ترجمان القرآن۔ فاضل مضمون نگار نے یہاں استدلال کا رُخ الٹا پھیر دیا ہے۔ انکے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کی راہ ایک ہی صحیح ممکن العمل راہ اس وجہ سے ہے کہ دائیں بائیں متوجہ ہونا تجربہ سے مہلک ثابت ہوا۔ حالانکہ دراصل اس راہ کے صحیح ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے بلکہ انسان کے ہلاکت میں مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس راہ سے ہٹا۔ فاضل موصوف کے طرزِ بیان سے آدمی کو یہ غلط فہمی لاحق ہو سکتی ہے کہ قرآن نے اس راہ کو انسان کے تاریخی تجربات سے اخذ کیا ہے یعنی ہزارہا برس کے تجربات سے معلوم ہوا کہ انسان جب کبھی اس طرف یا اُس طرف ہٹا، ہلاک ہو گیا، لہٰذا اس علم کی روشنی میں اس نے دونوں طرفوں کے درمیان ایک بیچ کی راہ نکال لی جو سیدھی اور صحیح ہے اسلیے کہ تاریخ کا تجربہ اسکو ایسا ہی ثابت کرتا ہے"۔ حالانکہ قرآن کا علم تجربات و مشاہدات سے اخذ کیا ہوا علم نہیں ہے۔ علم کی یہ نوعیت انسان کے لیے خاص ہے۔ قرآن کے مصنف، خداوند برتر کے علم کی یہ نوعیت نہیں ہے۔ اس نے تو انسان کو خود بنایا ہے۔ وہ اپنی ساخت کو اور اس کے مزاج کو بذاتِ خود جانتا ہے۔ اسی ذاتی علم کی بنا پر وہ صانع کے سے تحکم کے ساتھ کہتا ہے کہ تو اس فطرت پر بنایا گیا ہے اور تیرے لیے یہ راہ صحیح ہے۔ رہے وہ شواہد جو قرآن میں انسانی تاریخ سے پیش کیے گئے ہیں تو وہ اس حیثیت سے نہیں ہیں کہ یہ وہ مواد ہے جس سے دین قیم کا استنباط کیا گیا ہے بلکہ انکے پیش کرنے کا مدعا انسان کو یہ بتانا ہے کہ تو خود اپنے تجربات کی کسوٹی پر اس راہ کو پرکھ کر دیکھ لے، جب تو اس پر چلا تیری زندگی کی کل سیدھی چلی اور جب کبھی تو اس سے ہٹا وہ بگڑ گئی۔ آگے چل کر متعدد مقامات پر اس مضمون میں ایسے فقرے ملتے ہیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ قرآن اور نبی صرف تجربات سے حاصل شدہ علم کو پیش کرتے ہیں۔ ان تمام مقامات کی تصحیح کے لیے یہ تنبیہ کافی ہے۔

کہ ترجمان القرآن۔ یہ الفاظ بہر غلط فہمی پیدا کرنے والے ہیں۔ انسان کی فطرت میں اس کے خالق نے فجور اور تقویٰ کا وجدانی علم ضرور رکھ دیا ہے، دونوں راہوں کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کی استعداد ضرور ودیعت کی ہے مگر حتمی و قطعی طور پر یہ جاننا کہ یہی تقویٰ کی راہ ہے، یہی مقتضائے فطرت ہے، اور اسی میں خیر و صلاح ہے، تنہا انسانی فطرت کے بس کی بات نہیں ہے۔ انسان یہاں پہنچ کر صانع کی طرف سے رہنمائی کا محتاج ہے۔ اسکی طرف سے جلی اور روشن رہنمائی کے بغیر وہ محض اپنی فطرت کی رہبری میں اس راہ کا خود اکتشاف نہیں کر سکتا۔ البتہ جب وہ راہ سامنے پیش کر دی جائے تو فجور و تقویٰ کا وہ وجدانی علم جو اسکی فطرت میں موجود ہے، اُس راہ کو خود اپنی گم گشتہ چیز کو پہچاننے میں مدد ضرور دے سکتا ہے، بشرطیکہ اکتسابی علوم کی کج رفتاری اور تعصبات و رجحاناتِ نفس کی غلط افتاد نے اس وجدان کو مسخ نہ کر دیا ہو۔

(۴) یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تم میں سے اکثر واقف نہیں۔
اسی کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "الفطرۃ" کہا۔

ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ

"ہر پیدا ہونے والا اسی ایک فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے جس پر اس کی ہدایت کا پورا بوجھ رکھا جاتا ہے۔ یہ پھر تم ہو کہ اُسے مختلف نام دے دیتے ہو[1]۔"

(۵) یہی فطرت جس کے سہارے انسان زندگی کے لمبے سفر کو طے کرنے نکلا ہے یہ دین القیم ہے۔ یہی راہ ہے جو تمہیں قائم رکھتی ہے۔ مٹنے سے بچاتی ہے۔ ہلاکت سے بچاتی ہے اور قیام کی[2] ضامن ہے۔

[1] ترجمان القرآن۔ پہلا فقرہ ارشاد نبویؐ کے مطابق ہے، مگر بعد کے دونوں فقرے خود قائل (مسلم) کے مدعا سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔ حضورؐ نے نہ اس حدیث میں یہ فرمایا ہے اور نہ کبھی کسی موقع پر آپؐ نے ایسا کہا کہ ہر ہر انسان کی اپنی فطرت ہی پر اس کی "ہدایت کا پورا بوجھ" رکھ دیا گیا ہے۔ اگر بات یہی ہوتی تو خدا کی طرف سے الگ مستقل ہادی آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ رہا تیسرا فقرہ تو وہ بھی حدیث کے مفہوم سے پوری طرح مطابق نہیں ہے۔ حضورؐ کا مدعا در اصل یہ تھا کہ ہر بچہ اُس صحیح فطرت پہ پیدا ہوتا ہے جس پر اللہ نے انسان کو بنایا ہے۔ لیکن جس سوسائٹی میں وہ آنکھیں کھولتا ہے وہ اگر فطرت کی راہ سے ہٹی ہوئی ہو تو وہ اس بچے کو بھی اپنی غلط راہ پر لگا لیتی ہے۔

[2] ترجمان القرآن۔ عربی زبان میں قیام کا اصل مفہوم راستی و کجی کی ضد ہے۔ دین قیم وہ راہ ہے جو خود سیدھی اور مستقیم ہے، اور جو اپنے رہرو کی زندگی کو راستی پر قائم رکھنے والی اور کجی سے بچانے والی ہے۔ مٹنے اور ہلاک ہونے سے بچنا اس راستی و راست روی کا نتیجہ ضرور ہے مگر فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے۔ عموماً مغربی نظریات کے اثر سے بقاء (SURVIVAL) اور تسلسل حیات (CONTINUED EXISTENCE) کی اہمیت لوگوں کی نگاہوں میں زیادہ ہو گئی ہے اس لیے وہ "دین قیم" کے لفظ میں جب قیام کا مادّہ دیکھتے ہیں تو خواہ مخواہ ان کا ذہن بقاء اور تسلسل حیات ہی کے مفہوم کی طرف چلا جاتا ہے۔

انسان کس کے سہارے چلتا ہے؟ فطرت کے۔ فطرت کا طریق کار یا مذہب عمل کیا ہے؟ اصلاح و تعمیر۔ وہ دین القیم ہے۔ تمہاری زندگی کو قائم رکھنے والی راہ۔

قرآن ہمیں اپنے عمرانی پیغام کی صحیح معرفت عطا کرنے کے لیے ہماری حیات کے زمینی تجربات کو ہمارے سامنے پھیلاتا ہے۔ اور صرف ان اعمال کو جنہیں ہم نے خود دیکھا کہ وہ ہمیں گھاٹے میں رکھتے چلے آئے ہیں وہ بدی کہتا ہے۔ ان کے برعکس وہ اعمال جو ہماری آنکھوں نے خود دیکھے کہ وہ آج تک اصلاح کا باعث بنتے چلے آئے ہیں، انہیں وہ نیکی یا بھلائی کہتا ہے۔ ہماری حیات ارضی کے لیے انہیں بہتر بتاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم روزمرہ کے معاملات میں (۱) سچائی (۲) فیصلہ کی پختگی (۳) اطاعت رسول اور اطاعت الہٰی کو اختیار کرو۔

کیوں؟ اس لئے کہ صرف یہی اعمال (۱) تمہارے روزمرہ کے معاملات میں اصلاح اور بناؤ پیدا کر سکتے ہیں (۲) تم سے تمہاری بدیوں کو کاٹ کر الگ کر سکتے ہیں (۳) تمہیں کامیاب زندگی عطا کریں گے۔

اب ان مقامات کو سامنے رکھ کر سورۂ احزاب پڑھو:۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۙ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ (احزاب ۷۰، ۷۱)

حق شناس آنکھیں رکھتے ہو تو دیکھو اطاعت خدا و رسول کو بھی کسی معروضی حسن (OBJECTIVITY) کے لیے قبول کر لینے کو نہیں کہا۔ بلکہ کہا تو یہ کہا کہ تم دیکھ چکے ہو کہ یہ تمہاری اصلاح کا باعث ہے[1]۔

قرآن کہتا ہے:۔

[1] ترجمان القرآن۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اطاعت خدا و رسول سلیے کرو کہ تجربہ سے اس کا موجب صلاح ہونا ثابت ہوا ہے۔ بلکہ اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ ایسا کرو گے تو اللہ تمہارے اعمال کو درست کر دے گا اور تمہیں کامیابی عطا کرے گا۔

آپس میں نہ جھگڑو۔ اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی معروضی بدی ہے۔ بلکہ اس لیے کہ ایسا کرنے سے انسان کی زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ اس میں فساد اور ہلاکت آجاتی ہے۔ مٹنے والوں کے آثار باقیات سے پوچھ لو کہ ایسا کرنے سے تمہاری طاقت سست پڑ جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اس کے بجائے تم یہ کرو کہ

(۱) اللہ اور اس کے رسول کے اطاعت گزار بن جاؤ۔

(۲) صبر کرو یعنی مصائب کے مقابلہ میں عزم کے ساتھ کھڑے رہو اس لیے کہ بالآخر جیت اُسی کی ہو گی جو زیادہ مشکلات جھیلنے والا ہو گا۔

اور یہ چیزیں کوئی نئی نہیں۔ انسان نے ان کو خود عملاً دریافت کیا ہے۔ یہ اُس کے اپنے دل کی آوازیں ہیں۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۚ (الانفال - ۴۵)

(۱) جو لوگ اللہ کے سامنے اس طرح کھڑے ہوتے ہیں جیسے وہ ایک باجلال بادشاہ کے حضور رہوں۔

(۲) جو لوگ ہر نکمی بات سے بچتے ہیں۔

(۳) اپنی کمائی سے محتاجوں کو دیتے ہیں۔

(۴) زنا سے الگ ہوتے ہیں۔

(۵) امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

(۶) وعدہ کے پکے ہوتے ہیں۔

اُن کے کاموں میں بگاڑ یا فساد رہ نہیں پاتے۔ انسان کی ہر بستی کی یہ ایک آزمائی ہوئی حقیقت ہے۔ ایسے لوگ آج تک فلاح پا چکے ہیں اور آئندہ پاتے رہیں گے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ
فَاعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ (المومنون - ۱ تا ۶)

قد افلح - ماضی کا صیغہ یہاں خاص لطف دے رہا ہے۔

قرآن انسان کو اس کی لمبی سرگزشت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ تم سے پوچھتا ہے کہ کیا تم زمین کے احوال کو گھوم کر مشاہدہ نہیں کرتے؟ اپنے پچھلوں کے باقیات کو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتے؟ مٹنے والوں کے کھنڈرات سے جو صدائیں بلند ہو رہی ہیں کیا وہ تمہارے کانوں تک نہیں پہنچتیں؟ تمہارے سینوں کے اندر دل تو صرف اس لیے دیئے گئے تھے کہ تم اُن سے درس و عبرت کے خزانے جمع کر لیتے۔ ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے جس نوع کے اعمال اُن کے لیے اصلاح کا باعث ہوئے انہیں اختیار کر لیتے۔ جو انہیں ہلاکت کی طرف لے گئے اُن سے بچ جاتے۔ وہ اگر اپنی کوتاہیوں کی نذر ہو گئے تو تم اُن سے عبرت حاصل کرتے۔ دیکھو تم بھی ان کی طرح خرابی کی آزمائی ہوئی راہوں کو نہ آزماؤ۔ تمہارے آباء کی داستانِ حیات صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ پھر کیا تمہارے دل و دماغ نہیں کہ تم پھر اُنہی ہلاکتوں کو آزمانے جا رہے ہو۔ بس سمجھ جاؤ اور اُن شاہراہوں کی طرف پر سوچو جو تمہارے لیے بہتر اور نفع رساں ہیں یاد رکھو یہ وہ نتائج ہیں جنہیں تمہارے اجداد نے کئی ہزار برس میں مرتب کیا۔ وہ بھی کوئی تھوڑے دنوں کی فرصت میں ان نتائج پر نہیں پہنچے تھے۔ تمہاری گنتی کے ایک ہزار سال انسان کی مجموعی زندگی کے ارتقاء میں ایک دن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر جو مجموعی نتائج انسان نے اس کاوش سے مرتب کیے ہیں تم اُن سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔

یہ نہ سمجھو کہ آج سے ایک ہزار سال پہلے کے انسان سے تمہارا کوئی رابطہ نہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں تک انسانی حیات کی تعمیر اور انسانی فطرت کی رفتار کا تعلق ہے وہ ایک ہزار

سال تو ایک دن کے مانند ہیں یعنی اس کے ڈانڈے تمہاری زندگی سے اور تمہاری زندگی سے ایک ہزار سال کے بعد کے انسان کی زندگی سے اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے آج کا دن آنے والے اور گذرے ہوئے کل سے ملا ہوا ہے۔ پھر جیسے پیر کے نتائج سے منگل اور منگل کے نتائج سے جمعرات الگ نہیں اسی طرح تم انسانیت کے ماضی اور مستقبل کے درمیان کی ایک کڑی ہو۔ پھر کیا تمہارے پہلو میں دل نہیں کہ تم عبرت کے ذخائر جمع نہیں کر لیتے ؟

شاید تمہارے کان نہیں جس وجہ سے تم نہیں سنتے ۔تمہارے پاؤں نہیں کہ تم زمین کے گوشوں میں سفر کو نکلتے اور اپنے لیے ان اعمال کی جو آغاز آفرینش سے حیاتِ انسانیہ کی اصلاح کرتے چلے آئے ہیں، اور ان کی جو روزِ اول سے حیاتِ ارضی میں فساد پیدا کرتے چلے آئے ہیں، اپنی رہنمائی کے لیے ایک فہرست بناتے

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (الحج - ۴۵، ۴۶)

"کیا یہ لوگ ملکوں میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل اس قابل ہو جاتے کہ سمجھیں بوجھیں یا کان ہی کھل جاتے کہ حقیقت کی ترجمانی کرنے والے کی بات سنیں۔ دراصل آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جایا کرتے ہیں جو سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں۔ یہ لوگ تم سے عذاب کے مطالبہ میں جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدہ کے خلاف نہ کرے گا۔ مگر تیرے پروردگار کے ہاں ایک دن کی مقدار ایسی ہے جیسے تم لوگوں کی گنتی میں ایک ہزار برس"

اگر تم یہ عبرت اندوزی کی خواہش لے کر اپنے ماضی کے پاس جاؤ تو دیکھو گے کہ نسلِ انسانی کو نبیوں کی دعوت سے ہمیشہ فائدہ ہی پہنچا۔ انھوں نے ہمیشہ تمہاری مردہ روحوں کو زندہ کیا۔ پھر تم کبھی ان کی دعوت

سے زندگی حاصل کرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (الانفال ۲۴)

"ایمان لانے والو اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو جبکہ وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف بلائے جو تم کو زندگی بخشنے والی ہے"

جھٹلانے والے انہیں ہر عہد میں جھٹلاتے رہے۔ مگر اُن کا انجام کیا ہوا؟ ہولناک نتائج نے انہیں آلیا اور وہ تمہارے لیے دردناک داستانیں چھوڑ گئے تم ان کی ٹوہ میں نکلو۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ (آل عمران - ۱۳۶)

ایمان وتقویٰ (الانفال - ۲۸) فی سبیل اللہ خرچ کرنا (الانفال - ۶۰) عہدو پیمان کی پختگی (الانفال کی آخری آیات) ہدایت الٰہی کی پیروی (طٰہٰ - ۲۰) ان افعال کو تمہارے پچھلوں نے اپنی زندگی کے سفر میں آزما دیکھا ہے کہ یہ باعث اصلاح ثابت ہوتے رہے۔ ان کے برعکس جو اعمال کسی زمانہ میں بھی تمہاری اصلاح نہ کر سکے بلکہ فساد کا باعث رہے وہ یہ ہیں۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۝ (الکہف ۱۰۲ تا ۱۰۵)

"ان سے کہو ہم تمہیں بتائیں کون لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہیں؟ وہ جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کام بنا رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کے احکام وہدایات کو نہ مانا اور اس سے انکار کیا کہ انہیں ایک روز اس کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ اس لیے ان کے سارے کام اکارت گئے۔ اور اس لیے قیامت کے دن ہم ان کے اعمال کو کوئی وزن نہ دیں گے"

رسول کی ہستی اس سے زیادہ نہیں کہ وہ تمہیں ان زندگی کی آزمائی ہوئی راہوں سے آگاہ کرنے والا ایک انسان ہوتا ہے[1]۔ تم پر داروغہ نہیں ہوتا۔ تمہیں جبراً کسی راہ پر لانے کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ وہ اچنبھے اور عجائب کاریاں لے کر تمہارے پاس نہیں آتا۔ وہ تمہاری طرح بازاروں میں لین دین کرتا ہے وہ تمہارا کفارہ ہو کر نہیں آتا۔ تم اس کی باتوں کو ہنسی میں اڑا دو، تم اس کی ہدایت کو قبول نہ کرو تو وہ تمہارے قلوب، آنکھوں اور کانوں پر کوئی قبضہ نہیں رکھتا کہ بہروں کو سنا دے اور اندھوں کو دکھا دے۔ یہ اس کے بس کی باتیں نہیں نہ یہ کام اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ تمہاری طرح وہ بھی صرف اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

وَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل لِّي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۖ أَنتُم بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ۝ وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ۝ وَمِنْهُم مَّن يَنظُرُ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ۝ (یونس ۴۱-۴۳)

ان تجربات کو قرآن "نور" بھی کہتا ہے۔ دیکھو گے تو ان کی روشنی میں تمہاری زندگی کا ہر پہلو واضح ہو جائے گا۔ انسان جو جہل و جذبات کے حائلات سے ٹکراتا آگے بڑھ رہا ہے اور یہ اس کے اپنے مرتب کردہ اصلاح کے اصول ہیں[2]۔ وہ کہتا ہے کہ اس زمین کی وراثت ان مصلحین کے لیے وقف ہے جو ان اصول

[1] ترجمان القرآن۔ رسول کے منصب کی یہ تعبیر صحیح نہیں۔ وہ مورخ یا محقق انسانیات (ANTHROPOLOGIST) نہیں ہوتا جس کا کام انسان پر گزری ہوئی کیفیات کا جائزہ لینا اور لوگوں کو پچھلی نسلوں کی آزمائی ہوئی راہوں سے آگاہ کر دینا ہو۔ اس کا علم تجربات و مشاہدات سے اخذ کیا ہوا علم نہیں ہوتا بلکہ حقیقت کا علم ذاتی جو خالق کائنات کے پاس ہے وہ وحی کے ذریعہ سے براہ راست اس کے پاس آتا ہے۔ اور چونکہ وہ حقیقت نفسیہ کا علم ہوتا ہے اس لیے انسانی تجربات کی شہادت اس کی تائید کرتی ہے۔

[2] ترجمان القرآن۔ قرآن ان تجربات کو نور نہیں کہتا بلکہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی دانش و ہدایت کو نور کہتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ اصلاح کے جو اصول قرآن پیش کر رہا ہے وہ انسان کے اپنے مرتب کردہ ہیں۔ تاریخ اور انسانیات کے مطالعہ و تحقیق سے معلومات کا جتنا ذخیرہ آج تک فراہم ہوا ہے وہ سب کا سب سامنے رکھ کر بھی انسان اپنی فلاح و سعادت کے صحیح اصول خود مرتب نہ کر سکا +

کو پیشِ نظر رکھ کر زندگی کے سفر کو نکلیں اور یہ حقیقت صرف تمہارے لیے نہیں بلکہ زبور میں بھی ہم نے یہی کہا تھا یعنی یہ بہت پرانی حقیقت ہے۔ (الانبیاء ۱۰۴)

قرآن جب کسی برباد ہونے والی بستی یا قوم کا ذکر کرتا ہے تو ہر موقع پر یہ حقیقت دہرا دیتا ہے۔ کہ ہم کسی پر ظلم نہیں کرتے یعنی یہ جو اس بستی کو سزا دی گئی یہ کوئی معروضی واقعہ نہ تھا بلکہ انہوں نے خود ظلم کیا (سورہ توبہ ۶۹)۔ یہ اُن کے اندر کے اعمال تھے۔ یہ ایک موضوعی واقعہ تھا۔

اپیکیورس نے خوشی کو ڈھونڈا بینتھم نے خوشی کی بہتات (QUANTITY) کی آرزو کی جان اسٹوارٹ مل نے بہتر خوشی (QUALITY) پر زور دیا مگر کوئی بھی اس طرف نہ گیا کہ ان افعال کو تلاش کیا جائے جو خوشی پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ ہو سکتا کہ درخت کا تنہ تو نہ ہو مگر اُس کے ہرے بھرے پتے پھوٹ رہے ہوں تو مجرد خوشی کو تلاش کرنے والے ناکام نہ رہتے۔ غم اور خوشی تو تاثرات ہیں جو مختلف افعال کے نتائج ہوا کرتے ہیں۔

ایک کو یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانات میں کامیاب ہو کر خوشی ملتی ہے۔ ایک کو شراب کے جرعات میں۔ دونوں خوش ہیں۔ اب ایک تیسرا شخص جو ان کو دیکھ رہا ہے چاہتا ہے کہ اُسے بھی خوشی حاصل ہو مگر وہ نہ تو امتحانات میں بیٹھنا چاہتا ہے اور نہ شراب کو خریدنے کے لیے دام رکھتا ہے۔ تو بتاؤ کیا خوشی کا حصول اس کے لیے ممکن ہے؟ خوشی تو محض ایک نتیجہ تھی۔ پس تم کہو گے کہ وہ صحیح سوچ نہ سکا۔

خوشی کے متلاشیوں کے لیے صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ وہ ایسے درخت کی جستجو کرتے جس کی ٹہنیوں میں خوشی کے پھول آتے ہوں۔ مگر وہ اُلجھے رہے اور اس حقیقت کو نہ پا سکے۔

اب تم دیکھ چکے ہو کہ خوشی صرف اُن افعال سے پیدا ہوتی ہے جو حیات انسانیہ کے لیے آج تک بناؤ سنگھار کا ذریعہ ثابت ہوتے رہے ہیں۔ باعثِ صلاح رہے ہیں۔ جن میں تباہی اور فساد کا اصلاً کوئی امکان نہیں چنانچہ

۱۔ قرآن ماضی کو تمہارے سامنے رکھتا ہے۔

۲۔ تمہارے لیے ماضی نے جن امور کو باعثِ صلاح پایا انہیں شمار کرتا ہے! اور تمہیں اگر تم انہیں اختیار کر لو تو

ایک دائمی کامرانی کی بشارت دیتا ہے۔ زمین کو تمہاری وراثت بتاتا ہے۔ نبی کو وہ اسی لیے بشیر کہتا ہے اس لیے کہ وہ بشارت دیتا ہے۔ انّ الارض یرثھا عبادی الصالحون (الانبیاء - ۱۰۵)

۴۔ اور وہ افعال جنہیں تم دیکھ چکے ہو کہ وہ مفاسد ہیں ان سے تمہیں خبردار رہنے کے لیے کہتا ہے تمہیں انکے سو بار آزمائے ہوئے انجاموں سے ڈراتا ہے۔ نبی کو وہ اسی لیے نذیر کہتا ہے اس لیے کہ وہ ڈراتا ہے۔

یہ مقصود یہ کہ قرآن خود انسان کی فطرت کو اسکا رہنما بتاتا ہے۔ وہ اپنی اندرونی ہدایت سے زندگی کے سفر کو نکلا ہے۔

۵۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ انسان خوشی کی تلاش نہیں کرتا بلکہ اپنے قیام و صلاح کا طلبگار ہے۔ خوشی اگر فساد و ہلاکت کا باعث ہو تو وہ اُسے اختیار نہیں کرتا۔

کانٹ اس طائفہ (EPICUREANISM) کے مرض کے صحیح مقام پہ انگلی نہ رکھ سکا۔ وہ یہ نہ سمجھا کہ اس پر پھاہا کہاں رکھا جا سکتا ہے فکر کی غلطی کیا ہے اور اسکی صحت کیسے کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا وہ ایک دوسرے گوشے میں نکل گیا۔ وہ انسان کی فطرت کو مایوسی سے دیکھتا ہے۔ اس نے انسان سے الگ نیکی کا ایک نظامنامہ مرتب کیا اور انسان کو کہا کہ وہ اُسے قبول کرلے۔ اس نیکی کے معروضی نظریہ کی صحیح معرفت کے لیے تم ایک اندھے کو تصور کرو جو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں کرسکتا اور ایک بچے کی انگلی پکڑے بازار کی بھیڑ سے گزر رہا ہے۔ اسی طرح یہ معروضی مصلحین انسانی فطرت پر اعتماد نہیں رکھتے۔ وہ انسان کے اندھے ہاتھوں میں اپنا نظامنامہ دے کر اُسے زندگی کی تاریکیوں سے گزارنا چاہتے ہیں۔

غور کرو جب انسان فطرتاً اندھا ہے تو اسکی رہنمائی کیسی؟ تم نے کسی اندھے کو نہیں دیکھا کہ وہ بچہ جو لاٹھی تھامے اسکے ساتھ جاتا تھا وہ دن کے چوبیس گھنٹے اور گھنٹے کے ساٹھ منٹ اور منٹ کے ساٹھ سیکنڈ اسکے ساتھ رہ سکتا ہو۔ پھر اور دیکھو آگ فطرتاً جلاتی ہے تم اُسے جلانے سے روک نہیں سکتے۔ انسان اگر فطرتاً اندھا ہے تو تم کون ہو کہ اسے نظامنامہ کی لاٹھی دے کر اُس کی فطری کوری کو دور کرسکو۔

نیکی کا یہ معروضی یا خارجی تخیل تھا۔ ظاہر ہے یہ استدلال کے مطالبات کا ساتھ نہیں دیتا۔

اسلام اور اشتراکیت

(از جناب مولوی حکیم محمد اسحاق صاحب - کان پور)

اصل موضوع کے متعلق کچھ لکھنے سے قبل اس غلط فہمی کو رفع کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مضمون کا مقصود نظام سرمایہ داری کی حمایت کرنا نہیں ہے۔ نظام سرمایہ داری جس طرح اشتراکی کی آنکھ میں خار کی طرح کھٹکتا ہے اسی طرح مسلمان بھی اس کو انتہائی نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، اس کو انسانیت کے لیے ایک لعنت سمجھتا ہے اور اس کو مٹا دینے کی خواہش اشتراکی سے ہزار چند اپنے دل میں رکھتا ہے۔

یہاں تک تو مسلمان اور اشتراکی دونوں متحد ہیں لیکن اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظام سرمایہ داری کو مٹا کر دنیا میں کس قسم کا اجتماعی نظام رائج کیا جائے اور کن اصول اور بنیادوں پر دنیا کی تمدنی عمارت کی تعمیر کی جائے؟ یہاں پہنچ کر مسلمان اور اشتراکی کے درمیان اختلاف رونما ہو جاتا ہے۔ مسلمان اس سوال کے جواب میں اسلام کے نظریہ و نظام کو پیش کرتا ہے اور اشتراکی اشتراکیت کو اس مسئلہ کا حل قرار دیتا ہے۔

اسلام ایک ضابطۂ حیات اور قانون زندگی کا نام ہے۔ یہ ضابطہ اس قدر ہمہ گیر ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اس کے حدود سے باہر نہیں ہو سکتا۔ مسلمان اُسی شخص کا نام ہے جو اس ضابطۂ حیات کو مکمل طور پر قبول کر لے اس لیے کہ یہ ضابطہ قابل تقسیم نہیں ہے کہ اس کے بعض حصوں کو چھوڑ کر بعض دوسرے حصوں کو قبول کر لیا جائے اور پھر

بھی آدمی مسلمان ہو یا مسلمان رہے۔ زندگی کی کسی شاخ کے متعلق اگر مسلمان اسلامی اصول وضوابط کو نظر انداز کرکے غیر اسلامی اصول وضوابط کو قبول کرتا ہے تو بظاہر وہ ابتداءً اسی شاخ کی حد تک حدود اسلام سے باہر ہوتا ہے، مگر چونکہ زندگی کے مختلف شعبے ایک دوسرے کے ساتھ طبعاً اس طرح مربوط ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہے اور ایک کا دوسرے سے متاثر ہونا ضروری ہے اس لیے کسی ایک شعبہ حیات میں غیر اسلامی اصول وافکار کو اختیار کرنے کا اثر اسی شعبہ تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ پوری زندگی پر پھیل جاتا ہے اور دوسرے شعبوں کو بھی رفتہ رفتہ غیر اسلامی رنگ میں رنگ کر چھوڑتا ہے۔ اس طرح ایک دن وہ جزوی مرتد کلی طور پر دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت تنہا اسلام ہی کی نہیں ہے بلکہ ہر منضبط نظام کی خاصیت یہی ہے۔ اور یہی بنیاد اس اختلاف کی ہے جس کی وجہ سے مسلمان اور اشتراکی ساتھ مل کر نہیں چل سکتے۔ مسلمان کو نہ تو یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی مصلحت کی بنا پر اسلامی نظام میں ترمیم کرکے کسی دوسرے نظام کی کچھ چیزیں اس میں داخل کرلے۔ اور نہ وہ مسلمان رہ سکتا ہے اگر کسی غیر اسلامی ضابطہ کو کسی حالت میں بھی قبول کر لیتا ہے خواہ وہ ضابطہ اقتصادی ہو یا سیاسی یا زندگی کے کسی اور شعبہ کے متعلق۔ اس نے ایسا کیا تو قرآن مجید اس سے سوال کرے گا کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ؟ اور اس سوال کا کوئی جواب اس کے پاس نہ ہوگا۔

ان باتوں سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمان کا قومی تعصب اس انکار کا باعث ہے، یا محض مذہبی ضد کی وجہ سے وہ اپنے اس رویہ پر اڑتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی نظام ایک مدلل معقول منطقی نظام ہے، اس کی پشت پر اشتراکیت اور دوسرے تمام نظامات سے بہت زیادہ زبردست عقلی، تجربی اور نفسیاتی دلائل ہیں، اس میں دوسرے تمام نظامات سے زیادہ توازن پایا جاتا ہے، وہ انسانی زندگی کے تمام مسائل کو نہایت تشفی بخش طریقہ سے حل کرتا ہے، اور جو شخص اس نظام

کو سمجھ کر اس پر ایمان لایا ہو اس سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس سے فروتر نظاموں میں سے کسی کو قبول کرے گا۔ اشتراکیت جن کمزوریوں کی حامل ہے اسلام ان سے قطعاً پاک ہے۔ اور اشتراکیت سے جو فائدے مطلوب ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ بہتر طور پر اسلامی نظام سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ پھر کون نادان ہوگا جو کامل کو چھوڑ کر ناقص کو لے گا؟

ان تمہیدی سطور سے اشتراکیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی صحیح پوزیشن کی وضاحت مقصود ہے تاکہ یہ غلط فہمی رفع ہو جائے کہ اشتراکی کے مقابلہ میں مسلمان کی بھی وہی پوزیشن ہے جو روس کے مسیحی علماً کی وہاں کے اشتراکیوں کے مقابلہ میں تھی۔ اس غلط فہمی کی وجہ اسلام کے نظام فکر و عمل سے لاعلمی ہے اور اس کو قوی کرنے والی چیز اسلام کے بعض جاہل پیروؤں کی وہ غلط روش ہے جو انہوں نے اشتراکیت کے مقابلہ میں اختیار کی، یعنی انہوں نے اشتراکیت کے خلاف رائج الوقت غیر اسلامی اور غیر انسانی نظام اجتماعی کی حمایت شروع کر دی اور حدیث و قرآن سے اس کے لیے سند جواز حاصل کرنے کی سعی لاحاصل کی گویا کہ وہ عین اسلام ہے۔ حالانکہ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے اور حق یہ ہے کہ اسلام جس قدر اشتراکیت کا دشمن ہے اسی قدر وہ اس ظالمانہ سرمایہ داری کا بھی دشمن ہے وہ اگر لینن اور مارکس کے اصولوں کا رواج نہیں چاہتا تو وہ تعلقہ داری، جاگیرداری، مہاجنی وغیرہ انسانیت کش او ظالمانہ چیزوں کا بھی روادار نہیں ہے۔ مسلمان اشتراکیت کی مخالفت اس لیے نہیں چاہتا ہے کہ نظام سرمایہ داری محفوظ رہے بلکہ اس لیے چاہتا ہے کہ ان دونوں کے بجائے ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے جو ان دونوں سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

یہ اسلامی نظام اجتماعی سے لاعلمی ہی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے بہت سے افراد جن میں بدقسمتی سے بعض علما بھی شامل ہو گئے ہیں، اشتراکیت کو لبیک کہہ رہے ہیں اور ہندوستان میں اس کے رواج کے خواہشمند ہیں۔ مزید ستم یہ ہے کہ یہ حضرات مسلمانوں کو اشتراکیت کی جانب دعوت دیتے وقت

اسلام اور اشتراکیت کو بالکل مترادف ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بے راہ روی اور غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ذیل میں ہم ان اختلافات کا تذکرہ کرتے ہیں جو اسلامی معاشیات اور اشتراکیت کے درمیان پائے جاتے ہیں اور جن پر غائر نگاہ ڈالنے سے اسلامی اصول کی فضیلت بھی واضح ہو جاتی ہے

اسلام کا معاشی نظریہ اور اشتراکیت دونوں مقصد کے لحاظ سے متفق ہیں۔ دونوں اس معاشی ظلم کو مٹا دینا چاہتے ہیں جو نظام سرمایہ داری میں پایا جاتا ہے اور دونوں کا مقصد یہ ہے کہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو منصفانہ تقسیم سے بدل کر دنیا کی اقتصادی سطح کو بقدر امکان مستوی بنا دیا جائے۔ مگر محض مقصد کی وحدت دو چیزوں کو ایک نہیں بنا سکتی۔ یہودیت و نصرانیت دونوں کا مقصد ایک ہے لیکن دونوں کا فرق مخفی نہیں ہے۔ بودھ مت اور ہندو دھرم دونوں "نروان" کو اپنا مقصد قرار دیتے ہیں لیکن دونوں میں اس قدر فرق ہے کہ بودھ مت کو ہندو مذہب کے استھان میں جینا دشوار ہو گیا اور بالآخر اس کو چین میں پناہ لینی پڑی۔ قادیانیت کا راستہ اسلام سے الگ ہے لیکن ایک قادیانی بھی اپنے مذہب کا مقصد وہی بیان کرتا ہے جو اسلام کا ہے۔ لہٰذا محض اس بنا پر کہ معاشی اصلاح کے معاملہ میں اشتراکیت اور اسلام کا مقصد ایک ہے یہ کہنا کہ دونوں نظریئے ایک ہیں سخت غلطی ہے —— حیرت ہے کہ اسیران دام اشتراکیت کی سب سے محکم دلیل یہی ہے —— دو نظریوں میں اتحاد کے لیے وحدت مقصد کے علاوہ نقطۂ نظر اور طریق حصول مقصد کا اتحاد بھی ضروری ہے۔ اور یہ اتحاد یہاں مفقود ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے دونوں میں بعد المشرقین ہے۔

اشتراکیت کے بنیادی اصول اشتراکیت جس راستہ سے اپنے مقصد کو پہنچنا چاہتی ہے اس کے بنیادی اصول یہ ہیں:۔

(۱) دولت کی شخصی ملکیت کا استیصال کر دیا جائے۔

(۲) دولت اور وسائل دولت آفرینی پر تمام حقوق مالکانہ جماعت کو حاصل ہوں۔

(۳) دولت آفرینی اور تقسیم دولت کا پورا انتظام جماعت کے ہاتھ میں ہو، جس کی طرف سے حکومت اس وظیفہ کو انجام دے گی۔

تیسرا اصول اوّل الذکر دونوں اصولوں کا لازمی نتیجہ ہے۔

اسلام کے معاشی اصول اس کے مقابلہ میں اسلامی نظریہ معاشی کے بنیادی اصول بھی تین ہیں۔

(۱) دولت پر "قانون" کی ملک۔

(۲) دولت آفرینی، تقسیم دولت، اور استعمال دولت پر قانون کا مکمل اقتدار۔

(۳) حدود قانون کے اندر اشخاص کے لیے دولت کمانے، رکھنے اور خرچ کرنے کی پوری آزادی۔

قانون کی ملک کا کیا مفہوم ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے پہلے نفسِ ملک کے مفہوم کو ذہن میں حاضر کر لینا چاہیے۔ جب ہم کسی شخص کو کسی شے کا مالک کہتے ہیں تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کو اس شے میں ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے، نیز اس کو اسے اپنی ملک سے منتقل کر دینے کا حق بھی حاصل ہے۔ یہ دونوں حق محدود ہیں یا غیر محدود؟ ملکیت کے عین مفہوم میں یہ بات شامل ہے کہ یہ دونوں اصلاً غیر محدود حق ہیں۔ ان کے محدود ہونے کے معنی خود ملکیت کے محدود ہونے کے ہیں۔ اسی لیے خواہ سرمایہ دار ہوں یا اشتراکی یا کوئی اور، سب کے نزدیک مالک کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اپنی ملک میں ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہو۔ اس پر کوئی ایسی پابندی نہ ہو جو اس کو کسی طرح کے تصرف اور کسی نوع کے انتقال سے روک دے۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا میں ہر جگہ ملکیت کے ان حقوق پر کچھ پابندیاں عائد ہیں لیکن اصلاً اس سے ہمارے اس بیان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ وہ پابندیاں محدود مصالح کی بنا پر عائد کی جاتی ہیں۔ بنابریں اوّل تو ان میں کوئی استقلال نہیں ہوتا، دوسرے محدود مصالح سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کا اثر بھی محدود ہوتا ہے اور عالمگیر مصالح تک نہیں پہنچ سکتا اس لیے ان کا وجود عدم برابر ہے۔ بہرحال سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے نزدیک "ملک" کا یہی مفہوم تسلیم کیا گیا

ہے - فرق صرف اس قدر ہے کہ سرمایہ دار دنیا میں یہ حق افراد کو حاصل ہے اور اشتراکی دنیا میں یہ حق جماعت یا بالفاظِ دیگر جماعتی حکومت کو حاصل ہے ۔ بلکہ اب تو خود مرکزِ اشتراکیت یعنی روس میں یہ حق چھوٹے پیمانہ پر افراد کو بھی عطا کیا گیا ہے ۔

اسلام نے "ملکیت" کا یہ حق فرد اور جماعت دونوں سے چھین کر قانون یعنی شریعت کی طرف منتقل کر دیا ہے ۔ اسلام کا قانون مسلمانوں کی جان ، مال اور ان کی ہر چیز کا مالک ہے ۔ پھر وہ اپنی یہ ملکیت چند مخصوص ضوابط کے ساتھ امانت کے طور پر ان کے سپرد کرتا ہے ۔ اس امانت میں تصرف کرنے کے جتنے اور جیسے اختیارات اس نے فرد ، جماعت اور جماعتی حکومت کو دیئے ہیں ان سے تجاوز کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ۔ سب انہی ضوابط کے دائرے میں رہتے ہوئے دولت میں تصرف کر سکتے ہیں ۔ ان سے باہر قدم نکال کر جو تصرف بھی وہ کریں گے ناجائز ، غاصبانہ اور باغیانہ تصرف ہوگا ۔ یہ ضوابط ناقابلِ تغیر ہیں ، یعنی ان کو بدلنے کا حق نہ فرداً فرداً کسی مسلمان کو حاصل ہے نہ تمام مسلمانوں کو مل کر نہ مسلمانوں کی کسی حکومت کو ۔ اس طرح اسلام میں فرد و جماعت دونوں کی پوزیشن بالکل وہی ہوتی ہے جو کسی فرم کے ایجنٹ کی جو مالکانِ فرم کے بنائے ہوئے قوانین کے ماتحت مال کو صرف کر سکتا ہے لیکن ان ضوابط سے علیحدہ ہو کر اس میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا ۔

اسلام نے انسان کو خدا کا "ایجنٹ" ہونے کی حیثیت دی ہے ۔ وہ اس کو خلیفۃ اللہ کا خطاب دیتا ہے ۔ اس لیے اُس کو دولت حاصل کرنے ، دولت رکھنے اور دولت میں تصرف کرنے کے صرف وہی اختیارات حاصل ہیں جو اصل مالک یعنی حق تعالٰی نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعہ سے متعین کر دیئے ہیں ۔ ان کے سوا وہ کسی قسم کے حقوق یا اختیارات نہیں رکھتا [۵]

---

[۵] ترجمان القرآن ۔ ناقدانشناس انسان جب دنیا میں آکر زمین پر پھیلے ہوئے بے شمار وسائلِ زندگی دیکھتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ یہ ایک خوانِ یغما ہے جو میرے سامنے پھیلا ہوا ہے مجھے اس سے کچھ بحث نہیں کہ اس کو کس نے بچھایا (باقی بر صفحہ ۳۷۷)

طریقوں کا اختلاف دونوں نظریوں میں جو فرق و اختلاف ہے وہ مندرجہ بالا سطور پر نظر کرنے سے بالکل واضح ہو جاتا ہے اور اس کے مزید بیان کی حاجت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دونوں کے مناہج عمل میں بھی بہت بڑا اختلاف ہے جو آئندہ سطور سے واضح ہو جائے گا۔

اشتراکیت کے مناہج اشتراکیت کے مندرجہ ذیل عملی قاعدے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں:۔

(۱) پبلک کے ہر فرد کے لیے کام اور بقدر محنت[۱] اس کی ضروریات زندگی مہیا کرنا حکومت کا فرض ہوگا

(۲) کوئی شخص بلا توسط حکومت اپنے لیے کام اور ضروریات زندگی حاصل نہیں کر سکتا۔

(۳) کوئی شخص بغیر محنت کے اپنی ضروریات زندگی نہیں حاصل کر سکتا۔

(۴) جسمانی محنت کرنے والے اور دماغی محنت کرنے والے بالکل مساوی سمجھے جائیں گے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۶) ہے یا یہ خود ہی سجھ گیا ہے، بہر حال جب یہ بچھا ہوا ہے اور مجھے اس پر ہاتھ مارنے کی آزادی حاصل ہے تو اب میں خود ہی یہ فیصلہ کروں گا کہ کس طرح ——— کس کس طرح اس پہ ہاتھ ماروں۔ دنیا کے متعلق یہ نظریہ رکھنے والے لوگ اول اول اس قاعدے پر چلتے ہیں کہ جو جس کے ہاتھ لگ جائے وہ اسے لے اُڑے اور جس طرح چاہے استعمال کرے۔ پھر ان میں جوتی پیزار شروع ہوتی ہے۔ جو لوگ پہلے آکر خوان کے بیشتر حصے پر قبضہ کر چکے ہوتے ہیں ان کے مقابلہ میں بعد کے آنے والے، جو محروم رہ گئے ہیں جھگڑا اُٹھاتے ہیں اور لوٹ کر ان سے چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ دوسرے لوگ آتے ہیں اور اس جھگڑے کا یہ حل پیش کرتے ہیں کہ سارا خوان سب کا ہے، ایسے انتظام سے اس پر ہاتھ مارو کہ سب کا ہاتھ یکساں پڑے! ان مختلف گروہوں کے طریقے خواہ کتنے ہی مختلف ہوں، مگر اس بنیاد میں یہ سب متفق ہیں کہ یہ دنیا ایک خوان یغما ہے جو اتفاق سے ہمارے ہاتھ آگیا ہے، کوئی اس کا مالک نہیں ہے جس سے پوچھنے کی ہمیں ضرورت ہو۔ اسلام آکر ان سے کہتا ہے کہ بے وقوفو! یہ خوان یغما نہیں ہے، اس کا مالک موجود ہے تم اس پر من مانے طریقے سے ہاتھ مارنے کا حق نہیں رکھتے، صرف مالک ہی کو یہ طے کرنے کا حق ہے کہ اس خوان پر تمہارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ پس در اصل سرمایہ دار اور قوم پرست اور جہانگیر اور اشتراکی کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ بنیادی فرق صرف خدا شناس اور ناخدا شناس کے درمیان ہے۔

[۱] ترجمان القرآن۔ اشتراکیت کے اس قاعدے کی تاریخ کافی دلچسپ ہے۔ پہلے اس کی (باقی بر صفحہ ۳۷۸)

اور معاوضہ کے لحاظ سے دماغی محنت کرنے والوں کو زائد معاوضہ نہیں دیا جائے گا[1]	
اسلام کے مناہج	(۱) اشتراکی حکومت کی طرح اسلامی حکومت بھی پبلک کے ہر فرد کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۷) شکل یہ تھی " ہر ایک سے اس کی اہلیت کے مطابق اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق "۔ اس کے بعد اس میں ترمیم ہوئی اور یہ قاعدہ بنا " ہر ایک سے اس کی اہلیت کے مطابق اور ہر ایک کو اس کے اوقات کارکردگی کے مطابق "۔ پھر اس میں بھی ترمیم ہو گئی اور کتاب اشتراکیت کی اس "آیت" کو یوں لکھا گیا " ہر ایک سے اس کی اہلیت کے مطابق اور ہر ایک کو اس کے کام کی نوعیت و مقدار کے مطابق "۔ لینن کے "خلیفہ اوّل" اسٹالین نے اس کی جو تفسیر کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مقرر وقت میں کام کی مقرر مقدار انجام دینے پر مزدور کو مقرر شرح سے اجرت دی جائے، اور اس سے کہہ دیا جائے کہ اس سے زیادہ کام انجام دے گا تو انعام دیا جائے گا۔ پھر جب مزدور اُتنے وقت میں زیادہ زیادہ کام کر کے انعام حاصل کرنے لگیں تو کچھ مدت بعد کام کی مقدار کا اوسط بڑھا دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ اب اس سے زیادہ کام کرو گے تو انعام ملے گا۔ اس طرح تھوڑی تھوڑی مدت بعد مقدار کار کا اوسط بڑھایا جاتا رہے اور مزدور کی قوت کارکردگی آخری حد تک سونت لی جائے۔ اسی تفسیر کے مطابق روس میں (STAKHANOV MOVEMENT) شروع ہوئی جس پر آج کل روس کے تمام کارخانوں میں عمل ہو رہا ہے۔ اگر سرمایہ دار دنیا کے ظالم کارخانہ دار یہ طریقہ اختیار کریں تو مزدور ہڑتال کر کے انہیں کسی حد تک انصاف پر مجبور کر سکتے ہیں، مگر روس کا مزدور اپنے بنائے ہوئے خداؤں سے اس قدر عاجز ہے کہ بیچارے کے پاس انصاف حاصل کرنے کا یہ آخری ہتھیار بھی نہ رہا۔ یہ ہے اشتراکیت کی بنائی ہوئی جنت شداد کا حال!

[1] ترجمان القرآن - یہ قاعدہ بھی اب بدل چکا ہے۔ اجرتوں کی مساوات کا تخیل محض ایک خیالی چیز تھی جسے عملی اشتراکیت نے ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔ اب وہاں تنخواہیں کام کی نوعیت اور کارکن کی لیاقت کے مطابق دی جاتی ہیں۔ ۸۰ روبل سے لے کر ۱۲ سو، ۱۵ سو، ۱۸ سو، ۲ ہزار اور ڈھائی ہزار روبل تک تنخواہیں پانے والے کارکن موجود ہیں۔ بعض اہل قلم ۳ لاکھ روبل سالانہ تک رائلٹی اپنی کتابوں پر حاصل کرتے ہیں۔ اسی لحاظ سے ان کے مکان، لباس، خوراک، سواری وغیرہ میں بھی فرق ہے۔ رفتہ رفتہ وہ سب معاشی طبقات از سر نو پیدا ہو رہے ہیں جن کو مٹانے کے لیے روس میں اشتراکی انقلاب آیا تھا حتیٰ کہ سیونگ بینکوں میں روپیہ تک جمع ہوتا ہے اور اس پر تین سے لے کر دس فی صدی تک (حسب موقع) سود بھی ملتا ہے!

لیے کام اور ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ذمہ دار ہے[1]، مگر

(۲) ہر شخص اپنے لیے کام اور اپنی ضروریات زندگی بغیر توسط حکومت بھی مہیا کرسکتا ہے یہی نہیں بلکہ وہ اس کا اتنا ہی ذمہ دار ہے جتنی کہ حکومت۔

(۳) ہر شخص کے لیے اپنی روزی محنت سے پیدا کرنا ضروری ہوگا۔

(۴) عام حالات میں دماغی کام کی قدر و قیمت جسمانی کام سے زائد سمجھی جائے گی مگر غیر محدود نہ ہوگی بلکہ ایک مقررہ معیار و اصول کے مطابق ہوگی[2] جس کا تذکرہ آئندہ سطور میں ہوگا۔

(۵) دولت پیدا کرنے، جمع کرنے اور خرچ کرنے میں حکومت اور پبلک دونوں کی حیثیت ایک ایجنٹ کی سی ہوگی اور دونوں کو مندرجہ ذیل قوانین کے ماتحت ان امور کو انجام دینا پڑے گا۔

(الف) حصول دولت کے ذرائع صرف دو تسلیم کیئے جائیں گے۔ (۱) زمین اور وہ مواد جو

---

[1] ترجمان القرآن۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس بیان کا ماخذ کیا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اسلامی حکومت ہر شخص کو کم سے کم ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری تو ضرور لیتی ہے مگر کام فراہم کرنے کی ذمہ داری نہیں لیتی۔ اس بات کی ذمہ داری لینے کے لیے تمام حرفوں اور پیشوں پر سرکاری تسلط (STATE CONTROL) ضروری ہے، اور اسلام حکومت کو اجتماعی زندگی پر اتنا تسلط دینے سے انکار کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے دوسرے معنی تمام باشندگان ریاست کی دستہ بندی (REGIMENTATION) کر دینے کے ہیں جس کے بعد شخصی آزادی بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

[2] ترجمان القرآن۔ اجرتیں مقرر کرنا اسلامی حکومت کے حدود عمل سے خارج ہے۔ اس نے اس چیز کو عرف، رواج اور اجیر و مستاجر کے باہمی سمجھوتہ پر چھوڑ دیا ہے۔ البتہ خاص حالات میں اگر کسی اجیر یا اجیروں کے کسی گروہ پر ظلم ہو رہا ہو تو اس صورت میں حکومت مداخلت کرے گی اور انصاف کے ساتھ اجرتیں اور مزدوروں کے دوسرے حقوق مقرر کر دے گی۔ نیز اس بات کی بھی اسلام میں گنجائش ہے کہ حکومت ایسے حاکم مقرر کر دے جو اجیروں اور مستاجروں کے تنازعات کا تصفیہ کرتے رہیں اور کسی کو کسی پر ظلم نہ کرنے دیں۔

زمین میں ہے، (۲) محنت محض سرمایہ اس کا ذریعہ نہیں بن سکے گا۔[1]

(ب) حصول دولت کا ہر وہ طریقہ اختیار کرنا ممنوع سمجھا جائے گا جو اسلام کے بتائے ہوئے انفرادی یا اجتماعی نظام حیات کے کسی شعبہ میں تنزل کا سبب بن سکے، یا مفاد عام کے خلاف ہو اور تکلیف و پریشانی کا سبب بن جائے، مثلاً سود، جوا، احتکار کسی صورت میں جائز نہیں رکھے جا سکتے۔

(ج) حکومت اور پبلک میں سے کوئی بھی دولت میں کوئی ایسا تصرف کرنے، یا دولت کو گردش سے روک کر رکھنے کا حق نہیں رکھتا جس کا نتیجہ اجتماعی طور پر ذہنی، اخلاقی، عملی، اقتصادی یا اور کسی شعبۂ حیات میں تنزل و نقصان کا سبب بن سکے یا مفاد عام کے خلاف ہو۔

(د) ہر فرد و جماعت کے لیے (جس میں حکومت بھی شامل ہے) دولت میں ایسے تصرفات کرنا لازم ہے جن کو اسلام نے اجتماعی فلاح کی خاطر ایجاباً فرض کیا ہے، مثلاً زکوٰۃ وغیرہ شرعی محاصل کا ادا کرنا پبلک کے لیے ضروری ہے اور ان کو وصول کر کے ان کے مصارف میں صرف کرنا حکومت پر واجب ہے۔

(نوٹ) یہ امر کہ کون سے امور موجب فلاح ہیں اور کون سے نہیں، اس کا تعین اسلامی اصول کریں گے نہ کہ پبلک یا حکومت کی رائے۔

اختلافات اسلام کے اقتصادی ضابطہ اور اشتراکیت کے درمیان یہ چند بڑے اور نمایاں اختلافات ہیں جن سے دونوں کا فرق بادنیٰ تامل واضح ہو جاتا ہے۔ یہ محض سطحی اختلافات نہیں بلکہ اساسی و اصولی ہیں۔ قلیل نہیں، کثیر ہیں، صرف نظری ہی نہیں، عملی بھی ہیں۔ ان اختلافات پر نظر کرنے سے ہم کو اسلامی

---

[1] ترجمان القرآن - یہ کلیہ صحیح نہیں ہے۔ اسلام میں یہ بالکل جائز ہے کہ ایک شخص سرمایہ دے اور دوسرا شخص اس پر محنت کرے۔ اور دونوں نفع و نقصان میں باہمی قرارداد کے مطابق شریک ہوں۔ البتہ سرمایہ کو دولت پیدا کرنے کا ایسا ذریعہ تسلیم کرنے سے اسلام انکار کرتا ہے کہ سرمایہ دار کو بہر حال اس کے سرمایہ کی مقدار کے لحاظ سے ایک مقرر شرح منافع ملتی رہے خواہ سرمایہ استعمال کرنے والے کو نفع ہو یا نقصان۔

اقتصادیات اور اشتراکیت کے درمیان ایک بہت بڑے اختلاف کا پتہ چلتا ہے جس کے موجود ہوتے ہوئے دونوں میں کسی موقع پر اتحاد نہیں ہو سکتا۔ یہ اختلاف دونوں نظریوں کی روح کا اختلاف ہے۔

اشتراکیت سرتاپا مادّیت محض ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک اس میں روحانیت و اخلاقیت کی جھلک بھی نہیں نظر آتی۔ وہ محض ایک اقتصادی نظریہ ہے لیکن ایسا اقتصادی نظریہ جو انسانی زندگی کے کل اجزاء کو اقتصادیات میں جذب کر دیتا ہے۔ اس کی ابتدا بھی پیٹ سے ہوتی ہے اور انتہا بھی پیٹ پر۔ غرض اس کی بنیاد محض جذبۂ شکم پرستی اور خواہش تن پروری پر قائم ہے[1]۔ بخلاف

[1] ترجمان القرآن۔ دراصل مغرب کی جدید تہذیب کلیتہً اس مفروضہ سے پیدا ہوئی ہے کہ انسان صرف ایک حیوان ہے۔ انسانیت کا کوئی تصور ان کے ذہن میں حیوانیت سے الگ اور اس سے بالاتر نہیں ہے۔ وہ انسانی فطرت کے اُنہی داعیات و مطالبات کو اصلی اور بنیادی تسلیم کرتے ہیں جن کا منشا و مبدا انسان کی حیوانیت ہے۔ رہے وہ پاک اور عالی مرتبہ اخلاقی و روحانی مطالبات جن کا اقتضاء خالص انسانیت کرتی ہے تو ان میں سے بعض کو وہ دبا تے ہیں، بعض کو اوہام و خرافات سمجھ کر ٹال دیتے ہیں، بعض کو محض گرمی سخن کے لیے نمائشی اہمیت دیتے ہیں، اور بعض کو اپنے حیوانی دستور زندگی میں داخل کرتے بھی ہیں تو اس طرح کہ وہ حیوانیت کے تابع ہو کر پاک کے بجائے ناپاک ہو کر رہ جاتے ہیں مثلاً ذوق جمال (AESTHETIC TASTE) جس کا وہ بدترین حشر یورپ میں ہوا ہے کہ جانور بھی دیکھ کر شرمائیں

مارکس اور اس کے پیرو اسی تہذیب کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس منافقانہ روش کا خاتمہ کر دیا جو اخلاق و روحانیت کے بارے میں اہل مغرب نے عموماً اختیار کر رکھی تھی۔ انہوں نے زندگی کے اس حیوانی تصور کو اس کے آخری منطقی نتائج تک پہنچا دیا اور ان تمام بے جوڑ چیزوں کو آدم زاد کی زندگی کے دستور سے خارج کر دیا جو اس حیوانی تصور کے ساتھ ربط قبول نہیں کرتیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان جب حیوان ہے تو لامحالہ اس کی زندگی میں اہم ترین اور فیصلہ کن چیز معاش ہی ہونی چاہیے۔ جانور کا دماغ جو کچھ سوچتا ہے اور اس کے دل میں جو کچھ جذبات پیدا ہوتے ہیں ان سب پر آخر معدے اور جسم کا یہی مطالبہ تو حکومت کرتا ہے کہ اپنے جسمانی وجود کو برقرار رکھنے کے لیے غذا حاصل کی جائے اور پھر یہ کہ نوعی وجود کو قائم رکھنے کے لیے صنف مقابل سے میل کیا جائے۔ بس یہی چیز اس دو پاؤں (باقی بر صفحہ ۴۲۳)

اس کے اسلام کا اقتصادی نظریہ مادیت و روحانیت کے صحیح ترین امتزاج سے عبارت ہے۔ اس کی بنیاد انسان کے ذہنی و اخلاقی ارتقاء پر رکھی گئی ہے۔ اور اس میں پیٹ کے ساتھ انسان کے قلب و دماغ کی بھی پوری رعایت رکھی گئی ہے! اسلام کا اقتصادی نظریہ محض اقتصادی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسا اخلاقی معیار بھی ہے جس سے انسان کی عملی زندگی خصوصاً اس کے معاشی مسائل کے حسن و قبح کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی بنیاد کسی جذبہ پر قائم نہیں ہے بلکہ عقل خالص اور اخلاقیت صحیحہ پر رکھی گئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۱) والے جانور کی زندگی پر بھی حکمراں ہے۔ تہذیب، اخلاق، مذہب، علوم و افکار سب کے سب اسی حکمراں کے تابع ہیں، اسی کی مرضی کے مطابق بنتے ہیں اور اسی کی مرضی سے بگڑتے اور بدلتے ہیں۔ پوری انسانی تاریخ مارکس کی نگاہ میں معاش کے محور پر گھومتی رہی ہے اور گھومتی رہے گی۔ جتنے مذہب پیدا ہوئے ان کو معاش کے سوال نے پیدا کیا۔ اخلاق کے جتنے اصول بنے سب کے سب معاشی بنیاد پر بنے۔ انسانی تہذیب اس کے سوا کچھ نہیں کہ معاشی حالات و ضروریات کی پیداکردہ ایک چیز ہے۔ انسان کے دل اور دماغ کی اس کے سوا کوئی حیثیت نہیں کہ وہ جسم اور اس کے مطالبات کی خدمت کے لیے تدبیریں سوچیں اور بہتر سے بہتر خدمت انجام دینے کی فکر میں رہیں۔ یہ ان لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا خلاصہ ہے اور اسی وجہ سے مارکس اور اس کے پیروؤں نے تمام انسانی مسائل کو معاش اور صرف معاش کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسلام کا راستہ پہلے ہی قدم پر ان سے جدا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کو انسان سمجھتا ہے نہ کہ حیوان۔ بلاشبہ انسانیت کا قالب حیوانی ہے اور اس حیوانی قالب کے مقتضیات (حفظ نفس و حفظ نوع) کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے، لیکن انسانیت کے اصلی مسائل اور انسانی فطرت کے داعیات و مقتضیات اس سے بلند تر ہیں اور اسلام کی نگاہ میں ایک صحیح نظام تمدن وہی ہو سکتا ہے جو نہ صرف ان دونوں پر نگاہ رکھے، بلکہ ہر ایک کو اس کے مرتبہ کے مطابق اہمیت دے۔ اشتراکیت کے نزدیک انسان کی کل زندگی معاشی ہے اور زندگی کے باقی تمام پہلو معیشت کے تابع ہیں۔ اور اسلام کے نزدیک معیشت انسان کی زندگی کے لیے ہے اور خود انسان کی زندگی ایک بڑے مقصد کے لیے ہے، اور اس بنا پر معیشت کو اس بڑے مقصد کے تابع ہونا چاہیے۔ یہ ان دونوں کے درمیان بنیادی فرق ہے۔

ہے۔اس کا یہ امتیاز اس کو کسی مقام پر بھی اشتراکیت کے دوش بدوش نہیں چلنے دیتا۔البتہ اگر غور کرو تو اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کی "روح" ایک ہی نظر آئے گی۔دونوں نفس پرستی اور بہیمیت کی پیداوار ہیں۔فرق صرف مظاہر کا ہے۔اسلام ان دونوں سے کہیں برتر ہے۔

اشتراکیت کے نقائص ذیل میں ہم ان نقائص کو نمبروار ذکر کرتے ہیں جو اشتراکیت کے لوازم میں سے ہیں تاکہ اسلام کے اقتصادی نظام کی برتری و فوقیت پورے طور پر واضح ہو جائے۔

(۱) اشتراکیت انسانی افراد میں اقتصادی مساوات قائم کرنا چاہتی ہے لیکن یہ مقصد اشتراکیت سے نہ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔اس لیے کہ اس میں اقتصادی نظام کے ساتھ کسی نہ کسی سیاسی نظام کا اختیار کرنا ضروری ہے اور سیاسی نظام کی عقلاً صرف دو صورتیں نکلتی ہیں،جمہوری اور شخصی۔اب اگر اس کے ساتھ جمہوری طرز حکومت کو اختیار کیا جائے گا تو جو پارٹی برسر اقتدار ہو گی وہ جمہور کی کل دولت پر قابض ہو گی اور کمزور پارٹی اس میں اپنے اختیار سے کوئی تصرف نہ کر سکے گی۔یہ صورت بعینہٖ وہی ہے جو سرمایہ دار ممالک میں سرمایہ داروں اور غرباء کی ہے۔اور اگر جمہوریت کو چھوڑ کر شخصی طرز حکومت اختیار کیا جائے گا تو شناعت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔اس لیے کہ اس صورت میں فرد واحد کل دولت پر قابض ہو جائے گا جو سرمایہ داری کی بدترین شکل ہے۔کہا جا سکتا ہے کہ دونوں صورتوں میں برسر اقتدار پارٹی یا ڈکٹیٹر دولت کا صرف محض مفاد عام کے لیے کر سکتا ہے نہ کہ اپنی ذات کے لیے،اس لیے اس میں امارت و غربت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہونے پاتا۔مگر یہ عذر ناقابل سماعت ہے کیونکہ مفاد عام کا تعین اور تصرف کی نوعیت مقرر کرنا برسر اقتدار جماعت یا فرد ہی کے اختیار میں ہے غرض سرمایہ دارانہ نظام کو اشتراکیت سے تبدیل کرنا "فرمن المطر وقر تحت المیزاب" (بارش سے بھاگ کر پرنالے کے نیچے پناہ لی) کا مصداق ہے۔

(۲) حکومت اور پبلک کے درمیان اتحاد کے بجائے افتراق و عدم تعاون کی اسپرٹ پیدا

ہو جاتی ہے جس سے دونوں کے درمیان ایک ایسی کش مکش برپا ہوتی ہے جس کا مٹا دینا ناممکن ہے۔

(۳) اس کش مکش کو مٹانے کے لیے حکومت کو سخت گیری اور ظلم سے کام لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ روس کے مشہور قحط کے واقعات اس کی مثال ہیں۔

(۴) پبلک کی فطری خواہشوں کو دبانے کے لیے طرز حکومت استبدادی اختیار کرنا پڑتا ہے روس کی جمہوریت کا آمریت میں تبدیل ہو جانا اس کی واضح مثال ہے[1]۔

(۵) پبلک کے کل معاملات کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے پبلک میں سے خود اعتمادی کا وصف مفقود ہو جاتا ہے۔ افراد میں اس کی صلاحیت نہیں باقی رہتی کہ وہ خود اپنی ذمہ داری پر اپنی زندگی کے معاملات انجام دے سکیں۔ اگر یہ چیز محض افراد تک محدود رہتی تو بھی غنیمت تھا لیکن چونکہ افراد ہی جماعت بناتے ہیں اس لیے رفتہ رفتہ اس کا اثر پوری جماعت پر محیط ہو جاتا ہے اور چند نسلیں گزرنے کے بعد خود اعتمادی کے اشد ضروری وصف کا جماعت سے بھی مفقود ہو جانا یقینی ہے آخر کار اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان افراد سے قائم کی ہوئی حکومت میں بھی یہ صلاحیت باقی نہ رہے گی کہ وہ کسی اہم کام

---

[1] ترجمان القرآن۔ روس میں کوئی فیکٹری ایسی نہیں ہے جس پر ہمیشہ سخت فوجی پہرہ لگا ہوا نہ ہو حتیٰ کہ کارخانوں کے اندر بھی فوجی سپاہی سنگین چڑھی ہوئی رائفلیں لیے ٹہلتے پھرتے ہیں۔ اس پہرہ داری کے لیے "سابوتاژ" (کارخانے تباہ کرنے کی سازشوں) کو بہانہ بنایا گیا ہے حالانکہ دراصل اس کا مقصد مزدوروں کو خوف زدہ رکھنا ہے تاکہ وہ حکومت کے عائد کردہ ضبط و نظام کے خلاف ہڑتال کرنا تو درکنار دم تک نہ مار سکیں۔ دراصل تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ اشتراکی حکومت ایک ایسے سرمایہ دار کا نام ہے جو تمام چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کو کھا کر ایک بڑا سرمایہ دار اور کارخانہ دار بنتا ہے۔ حکومت بھی اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے، تمام وسائل معیشت بھی اس کے قبضہ میں ہوتے ہیں، اور تمام ملک کی دولت پر بھی اس کا قاہرانہ تسلط ہوتا ہے۔ نظام سرمایہ داری میں کم از کم اس کا تو موقع ہے کہ ایک سرمایہ دار فرد یا کمپنی کو چھوڑ کر مزدور کسی دوسرے کے آستانے پر چلا جائے، یا حکومت سے فریاد کرے لیکن جہاں اشتراکیت کا وہ نا ظلم پرانٹر آئے وہاں یہ سب دروازے بند ہیں وہاں تو ایک ہی کارخانہ دار ہے، وہی حاکم بھی ہے اور رزق کے سارے دروازوں پر بھی وہی قابض ہے شیطان کے ترکش میں شاید یہ آخری تیر باقی رہ گیا تھا جو اس نے اب انسان پر چھوڑا ہے!

کو ذمہ دارانہ طور پر انجام دے سکے۔ اس کا لابدی اثر زندگی کے کل شعبوں میں ابتری، عمران و تمدن کی بربادی، اور انسانیت کی بربادی ہے۔

(۶) اقتصادیات پر حکومت کا قبضہ ہونے کی وجہ سے حکومت و سیاست کو تاجرانہ لائنوں پر چلانا پڑتا ہے حالانکہ تجارت و سیاست انسانی زندگی کے دو بالکل مختلف شعبے ہیں جن ذہنی صلاحیتوں اور اخلاقی اوصاف کی حاجت اول الذکر میں ہے ان سے بالکل مختلف اور متضاد فکری و اخلاقی اوصاف کی ثانی الذکر میں ضرورت ہے۔ ایسی حکومت جو تجارتی بنیادوں پر قائم کی جائے کبھی سیاست و فرمانروائی میں کسی مضبوط اصول اور مضبوط پالیسی پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کو مجبوراً ابن الوقت بننا پڑتا ہے۔ وہ اصول پرست کے بجائے زر پرست ہوتی ہے۔ وہ تجارتی و صنعتی مصالح کے لیے اصول کی بربادی کی کوئی پرواہ نہیں کر سکتی۔ اس کا کیرکٹر متضاد اصول سے مرکب ہونے کی وجہ سے مستقل اور پختہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے نتائج آخرکار ظلم و جبر اور پبلک کی عافیت تنگ ہونے کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں؟

(۷) ایسے نظام میں شخصی آزادی مسلوب ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے افراد کی ذاتی استعداد کا نشو و نما رک جاتا ہے اور جماعت اس کے ثمرات سے محروم ہو جاتی ہے۔

(۸) قوموں کے عروج و زوال اور ان کے فنا و بقا میں اخلاق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن اشتراکی نظام میں چونکہ کل نظام زندگی کا محور محض معاشیات کو بنا دیا جاتا ہے اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی کو صرف معاشی نقطۂ نظر پر ڈھالا جاتا ہے اس لیے اخلاقیات کا زوال یقینی و لابدی ہے۔ اخلاق کا زوال انسانیت کے فقدان کا ہم معنی ہے، اور اس کا لازمی اثر بہیمیت کا نشو و ارتقاء ہے جس کے پیدا ہو جانے کے بعد انسانیت میں مادیت کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ تجربہ شاہد ہے کہ دنیا کی کوئی طاقتور سے طاقتور قوم بھی اس درجہ پر پہنچ کر فنا ہونے سے نہیں بچ سکتی۔ وہ اہم ترین صفات جو انسانیت کی جان ہیں، اور وہ تمام چیزیں جن سے انسانیت کا قوام ہے،

اس کی نگاہ میں بے قدر وقیمت ہو جاتی ہیں، اور قدر صرف ان چیزوں کی باقی رہ جاتی ہے جن کی کوئی معاشی قیمت ہو، یا جن کا کوئی مادّی فائدہ ہو۔ کیا اس خالص حیوانیت کے ساختہ انسان جی سکتا ہے؟

(۹) دماغی محنت کی قدر وقیمت کو جسمانی محنت کی قیمت کے مساوی سمجھنا اور محض وقت کے لحاظ سے دونوں کو ان کی محنت کا معاوضہ دینا اصولاً خلاف انصاف ہے۔

(الف) دماغی کام کی افادی حیثیت جسمانی کام کی افادی حیثیت سے کہیں زائد ہے۔ ایک لائق انشاء پرداز اپنی انگلیوں سے جو کچھ کر سکتا ہے وہ دس ہزار مزدوروں کے ہاتھ مل کر بھی نہیں کر سکتے۔

(ب) تمام محققین کا اتفاق ہے کہ جسمانی محنت سے جسم کا جس قدر حصہ تحلیل ہوتا ہے اس سے دس گنا زائد دماغی محنت سے تحلیل ہو جاتا ہے، یعنی ایک گھنٹہ کی دماغی محنت اور دس گھنٹہ کی جسمانی محنت مساوی ہیں۔

(ج) اطبائے قدیم وجدید دونوں کا اتفاق ہے (جس کا تجربہ بھی ہر شخص کر سکتا ہے) کہ دماغی کام کرنے کی حالت میں جسم کا کل نظام عصبی اُسی کام کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے جس سے جسم کے ہر دوسرے کام کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ آلاتِ ہضم اپنا کام پورے طور پر انجام نہیں دے سکتے، تعمیر جسم کا کام رکا رہتا ہے اور تحلیل کا کام جاری رہتا ہے بلکہ اس کی رفتار دس گنی تیز ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تجربات بتاتے ہیں کہ امراض کا شکار زیادہ تر دماغی کام کرنے والے ہوتے ہیں۔ جسمانی محنت کرنے والے عموماً صحت وتندرستی کے لحاظ سے ان سے فائق ہوتے ہیں۔ خصوصاً دق، سل، ذیابیطس، ضعف اعصاب، قلت خون، وغیرہ مہلک امراض ۹۵ فی صدی دماغی محنت کرنے والوں کو ہوتے ہیں۔ ان حقائق کی موجودگی میں دماغی محنت اور جسمانی محنت

دونوں کو ایک ہی مرتبہ دینا قطعاً ظلم اور ناانصافی ہے۔

(ح) دُنیا کے ۹۹ فی صدی آدمی جسمانی محنت کے برابر دماغی محنت نہیں کر سکتے۔ مگر چونکہ اشتراکیت کے اصول دونوں کو ایک ہی مرتبہ دیتے ہیں اس لیے ایسے نظام میں مجبوراً ان کو جسمانی کام کے مساوی دماغی کام انجام دینا پڑے گا جس کا یقینی نتیجہ صحت و تندرستی کی بربادی اور موت کو دعوت دینا ہے۔

علاوہ بریں یہ اصول انسان کی طلب ارتقاء کو سرد کر دینے والا اور عالی ہمت لوگوں کی ہمتوں کو لپسپت کر دینے والا ہے۔

(۱۰) اشتراکیت چونکہ اپنی کوئی اخلاقی بنیاد نہیں رکھتی، اور اس نظام کے تحت افراد میں کوئی اندرونی جذبہ اس کی اطاعت و پیروی کا فطرۃً پیدا نہیں ہوتا اس وجہ سے یہ نظام صرف جابرانہ قوت کے زور پر ہی چل سکتا ہے۔ افراد ہمیشہ اس کے بند توڑ کر نکلنے کے لیے کوشاں رہیں گے اور صرف اسی وقت تک اس کے مطیع رہیں گے جب تک ایک آہنی شکنجہ انہیں کسنے کے لیے موجود رہے گا۔ اس شکنجہ کی گرفت ڈھیلی ہونے کے بعد خود اس نظام میں قیام و بقاء کی کوئی طاقت نہیں ہے۔ اس لیے یہ نظام ہر وقت زوال آمادہ رہتا ہے اور جابرانہ قوت کی ادنٰے کمزوری بھی اس کو فنا کے گھاٹ اُتار سکتی ہے۔

مندرجہ بالا نقائص کے ماسوا بھی اشتراکیت بہت سے نقائص و معائب کی حامل ہے جن کو ہم بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔

(باقی)

اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر

(۴)

روزہ

ضبط نفس اس تربیت کے ضابطہ میں کسنے کے لیے صرف دو خواہشوں کو منتخب کیا گیا ہے، یعنی شہوتِ شکم اور شہوتِ فرج۔ اور ان کے ساتھ ایک تیسری خواہش ـــــ آرام لینے کی خواہش ـــــ بھی زد میں آگئی ہے کیونکہ تراویح کے قیام اور سحری کے لیے آخر شب میں مزے کی نیند توڑ کر اُٹھنے کی وجہ سے اس پر بھی اچھی خاصی ضرب پڑتی ہے۔

حیوانی زندگی کے مطالبات میں یہ تین مطالبے اصل و بنیاد کا حکم رکھتے ہیں۔ بقائے نفس کے لیے غذا کا مطالبہ۔ بقائے نوع کے لیے صنف مقابل سے انصال کا مطالبہ۔ اپنی کھوئی ہوئی طاقتوں کو بحال کرنے کے لیے آرام کا مطالبہ۔ انہی تین ضرورتوں کا تقاضا تمام حیوانی خواہشات کا مبدا، اور تمام حیوانی اعمال کا محرک ہے، اور یہ تقاضا اتنا طاقتور ہے کہ حیوان جو کچھ کرتا ہے اسی کے زور سے مجبور ہو کر کرتا ہے۔

انسان کو خدمتگار اور آلۂ کار کی حیثیت سے جو بہترین ساخت کا حیوان دیا گیا ہے، اُس کے بنیادی مطالبات بھی یہی تین ہیں۔ اور چونکہ وہ تمام حیوانات سے زیادہ اونچی قسم کا حیوان ہے اس لیے اس کے مطالبات اُن سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ صرف زندہ رہنے کے لیے غذا ہی نہیں مانگتا بلکہ اچھی غذا مانگتا ہے، طرح طرح کی مزے دار غذائیں مانگتا ہے، غذائی مواد کی نئی نئی ترکیبوں کا مطالبہ کرتا ہے، اور اس کے اس مطالبہ میں سے انہی شاخیں نکلتی چلی جاتی ہیں کہ اسے پورا کرنے کے لیے ایک

دنیا کی دنیا درکار ہوتی ہے۔ وہ صرف بقائے نوع کے لیے صنف مقابل سے اتصال ہی کا مطالبہ نہیں کرتا' بلکہ اس مطالبہ میں ہزار نزاکتیں اور ہزار باریکیاں پیدا کرتا ہے۔ تنوع چاہتا ہے، حسن چاہتا ہے' آرائش کے بے شمار سامان چاہتا ہے، طرب انگیز سماں اور لذت انگیز ماحول چاہتا ہے، غرض اس سلسلہ میں بھی اس کے مطالبات اتنی شاخیں نکالتے ہیں کہ کہیں جا کر ان کا سلسلہ رکتا ہی نہیں۔ اسی طرح اس کی آرام طلبی بھی عام حیوانات کے مثل صرف کھوئی ہوئی قوتوں کو بحال کرنے کی حد تک نہیں رہتی، بلکہ وہ بھی بے شمار شاخیں نکالتی ہے جن کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا۔ وہ صرف کھوئی ہوئی طاقتوں کو بحال ہی نہیں کرنا چاہتا بلکہ چاہتا ہے کہ حتی الامکان قوتیں کھونے کی نوبت ہی نہ آنے پائے مشقت سے جی چراتا ہے، محنت کے بغیر کام نکالنے کی کوشش کرتا ہے، طرح طرح کی تدبیریں اس غرض کے لیے نکالتا ہے کہ بلا محنت یا کم سے کم محنت سے مقصد برآری ہو جائے، اور خصوصاً ایسے مقاصد کے لیے محنت کرنے میں تو اس کی جان پر بنتی ہے جو اس کے حیوانی مقاصد سے بالاتر ہوں

اس طرح ان تین ابتدائی خواہشوں سے خواہشات کا ایک لامتناہی جال بن جاتا ہے جو انسان کی پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتا ہے۔ پس دراصل انسان کے اس خادم" اس منہ زور حیوان کے پاس یہی تین ہتھیار وہ سب سے بڑے ہتھیار ہیں جن کی طاقت سے وہ اس کا خادم بننے کے بجائے خود اس کو اپنا خادم بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ہمیشہ زور لگاتا رہتا ہے کہ اس کے اور انسان کے تعلق کی نوعیت صحیح فطری نوعیت کے برعکس ہو جائے، یعنی بجائے اس کے کہ انسان اس پر سوار ہو الٹا وہ انسان پر سوار ہو کر اسے اپنی خواہشات کے مطابق کھینچے کھینچے پھرے۔ اگر انسان پوری قوت سے اس پر اپنا اقتدار مسلط نہ کرے اور تمیز وارادہ کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دے تو بالآخر وہ اس پر غالب آجاتا ہے۔ پھر وہ اپنے خدمتگار کا غلام اور اس کا خدمتگار اس کا آقا ہوتا ہے۔ علم اسماء کی جو نعمت اللہ نے اس کو دی ہے، فکر و استدلال اور تسخیر و ایجاد کی جو

قابلیتیں اسے عطا کی ہیں وہ سب کی سب اُس اندھے جاہل، نادان جانور کی خدمت میں لگ جاتی ہیں۔ بلندیوں پر اُڑنے کے بجائے پستیوں میں اُترنے کے کام آتی ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے انسانی مقاصد کی جگہ ذلیل حیوانی مقاصد حاصل کرنے کا آلہ بن جاتی ہیں۔ ان کا کوئی مصرف اس کے سوا باقی نہیں رہتا کہ رات دن بس اسی حیوان کی خواہشات پوری کرنے کے لیے نئے نئے وسائل تلاش کرتی رہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حیوان شرّ الدواب ——— تمام حیوانات سے بدتر قسم کا حیوان ——— بن کر رہ جاتا ہے۔ بھلا جس حیوان کو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے انسان جیسا خادم مل جائے اُس کے شر کی بھی کوئی حد ہو سکتی ہے؟ جس بیل کی بھوک کو بحری بیڑا بنانے کی قابلیت میسر آجائے زمین کی کس چراگاہ میں اتنا بل بوتا ہے کہ اس کے معاشی مفاد کی لپیٹ میں آنے سے بچ جائے؟ جس کتے کی حرص کو ٹینک اور ہوائی جہاز بنانے کی قوت مل جائے کس بوٹی اور کس ہڈی کا یارا ہے کہ اس کی کچلیوں کی گرفت میں آنے سے انکار کر دے؟ جس بھیڑیے کو اپنے جنگل کے بھیڑیوں کی قومیت بنانے کا سلیقہ ہو اور جو پریس اور پروپیگنڈا سے لے کر لمبی مار کی توپوں تک سے کام لے سکتا ہو زمین میں کہاں اتنی گنجائش ہے کہ اس کے لیے کافی LEBENSRAUM فراہم کر سکے؟ جس بکرے کی شہوت ناول، ڈراما، تصویر، موسیقی، رقص، ایکٹنگ اور حسن افزائی کے وسائل ایجاد کر سکتی ہو، جس میں بکریوں کی تربیت کے لیے کالج، کلب، فلمستان تک پیدا کرنے کی لیاقت ہو، اس کی داد عیش کے لیے کون حدّ و انتہا مقرر کرنے کا ذمہ لے سکتا ہے؟

ان پستیوں میں گرنے سے انسان کو بچانے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ اس کے سامنے انسانی زندگی کا اصلی نصب العین پیش کیا جائے اور اسے انسانی قوتوں کا صحیح مصرف بتایا جائے، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس حیوان کے ساتھ اُس کے تعلق کی جو فطری نوعیت ہے اس کو عملاً قائم کیا جائے اور مشق و تمرین کے ذریعہ سے سوار کو اتنا چُست کر دیا جائے کہ وہ اپنی سواری پر جم کر بیٹھے،

ارادے کی باگیں مضبوطی کے ساتھ تھامے، اور اس پر اتنا قابو یافتہ ہو کہ اس کی خواہشات کے پیچھے خود نہ چلے بلکہ اپنے ارادے کے مطابق اسے سیدھا سیدھا چلائے۔ اس حیوان کو خدا نے اس لیے ہمارے سپرد کیا ہے کہ ہم اس سے کام لیں اور اس کو اپنی زندگی کے مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ بنائیں اس کا دماغ ہمارے لیے فکر کرنے کا وسیلہ ہے۔ اس کے آلات حواس ہمارے لیے علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں ہمارے لیے سعی و عمل کرنے کے آلات ہیں جتنی چیزیں خدا نے اس دنیا میں ہمارے لیے مسخر کی ہیں ان میں سب سے زیادہ کارآمد چیز یہی حیوانی جسم ہے۔ اس کے اندر جتنی فطری خواہشات ہیں وہ سب اس کی حقیقی ضرورتوں سے تعلق رکھتی ہیں جن کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہم پر اس کا حق ہے کہ اسے آرام سے رکھیں، اس کو قوت بخش غذا دیں، بقائے نوع کے لیے اس کی طلب کو پورا کریں، اور اسے خواہ مخواہ ضائع نہ کردیں لیکن بہرحال یہ ہماری اور ہمارے مقصد زندگی کی خدمت کے لیے ہے نہ کہ ہم اس کی اور اس کے مقصد زندگی کی خدمت کے لیے۔ اس کو ہمارے ارادے کے تابع ہونا چاہیے نہ کہ ہمیں اس کی خواہشات کے تابع۔ اس کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ ایک فرمانروا کی طرح اپنی خواہشات ہم سے پوری کرائے بلکہ اس کا صحیح مرتبہ یہ ہے کہ ایک غلام کی طرح ہمارے سامنے اپنی خواہشات پیش کرے اور یہ ہماری تمیز دار و تربیت یافتہ خودی کا کام ہے کہ اس کی جس درخواست کو جب اور جس طرح مناسب سمجھیں پورا کریں یا رد کردیں۔

روزے کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد انسان کو اس کے حیوانی جسم پر یہی اقتدار بخشنا ہے۔ جو تین خواہشیں تمام حیوانی خواہشات کا مدار ہیں، جو تین ہتھیار اس حیوان کے پاس ایسے طاقتور ہیں کہ ان کے زور سے یہ ہمیں اپنا مطیع بنانے کے لیے اٹھتا ہے، روزہ انہی تینوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اس کے منہ میں مضبوط لگام دے کر اس کی راسیں ہماری اس خودی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جو خدا پر ایمان لائی ہے اور اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کا عزم کرچکی

ہے۔ اُس وقت اس جانور کی رُلیسپی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک یہ دانہ پانی مانگتا رہتا ہے اور ہم اس کو کچھ نہیں دیتے۔ یہ پانی کی طرف لپکنا چاہتا ہے مگر ہم باگیں کھینچ لیتے ہیں۔ یہ کھانا دیکھ کر اس پر منہ مارنا چاہتا ہے مگر ہم اسے جنبش نہیں کرنے دیتے۔ یہ کہتا ہے اچھا سگرٹ حقہ، پان کسی چیز سے تو مجھے اپنی آگ بجھا لینے دو مگر ہم اس کی ہر درخواست رد کر دیتے ہیں۔ یہ اپنے جوڑے کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے اور ملاعبت شروع کر دیتا ہے، مگر جہاں تسکین نفس کا سوال بیچ میں آیا اور ہم نے لگام کھینچ لی۔ اس طرح دن بھر اس کی خواہشوں کو ٹھکرانے کے بعد ہم اپنے مالک کے مقرر کیے ہوئے وقت پر اسے چارہ پانی دیتے ہیں۔ اب یہ تھکا ہارا چاہتا ہے کہ ذرا آرام لے مگر عشا کی اذان سنتے ہی ہم کان پکڑ کر اسے سیدھا اُٹھا کھڑا کرتے ہیں اور مسجد کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ دوسرے دنوں میں تو اسے عشا کے وقت تھوڑا ہی قیام کرنا پڑتا تھا۔ رمضان میں معمولی نماز کے علاوہ تراویح کی غیر معمولی رکعتوں کے لیے بھی ہم اسے کھڑا رکھتے ہیں۔ اس رگید سے نکل کر یہ چارہ سہنے کے لیے دوڑتا ہے اور چاہتا ہے کہ بس صبح کی خبر لائے مگر رات کے پچھلے پہر میں جبکہ اس کا رُواں رُواں میٹھی نیند کے نشے میں سرشار ہوتا ہے، ہم ایک چابک ایسا رسید کرتے ہیں کہ سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے پھر ہم کہتے ہیں کہ ہمارے مالک کا حکم دن کے بجائے اس وقت تجھے دانہ پانی دینے کا ہے لہٰذا جو کچھ کھانا چاہتا ہے اب کھا لے۔

یہ مشق ہے جو ہمیں ہر سال تیس دن تک کرائی جاتی ہے تاکہ اپنے اس خادم پر ہمیں پورا اقتدار حاصل ہو جائے۔ اس سے ہم اپنے جسم اور جسمانی قوتوں کے بااختیار حاکم بن جاتے ہیں۔ حیوانی خواہشات کی جابرانہ قہرمانی ختم ہو جاتی ہے۔ ہم میں اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنی جس خواہش کو جس حد پہ چاہیں روک دیں، اور اپنی جس قوت سے جس طرح چاہیں کام لے سکیں۔ وہ شخص جسے اپنی خواہشات کا مقابلہ کرنے کی کبھی عادت ہی نہ رہی ہو، جو نفس کے ہر مطالبہ پہ بے چون وچرا سر جھکا دینے کا خوگر رہا ہو، اور جس کے لیے حیوانی حیثیت کا ہر داعیہ ایک فرمان واجب الاذعان کا حکم رکھتا ہو، دنیا میں کوئی

بڑا کام نہیں کر سکتا۔ بڑے درجہ کے کام انجام دینے کے لیے بہرحال آدمی کی خودی میں اتنا بل بوتا ہونا چاہیے کہ وہ نفس کی خواہشات کو اپنے قابو میں رکھ سکے اور ان قوتوں کو جو اللہ نے اس کے نفس وجسم میں ودیعت کی ہیں اپنے ارادے کے مطابق استعمال کر سکے۔ اسی لیے رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ سال کے دوران میں کبھی کبھی نفل روزے بھی رکھنے کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے تاکہ اس اقتدار کی گرفت مضبوط رہے ہوتی لیکن بہت فرق ــــــ اصولی اور جوہری فرق ــــــ ہے اُس اقتدار میں جو اسلامی روزہ انسان کی خودی کو اس کے نفس وجسم پر دیتا ہے، اور اُس اقتدار میں جو غیر اسلامی طرز پر نفس کشی کی مشقوں یا قوت ارادی کو نشو ونما دینے کی ورزشوں سے حاصل کیا جاتا ہے، یا جو فطری طور پر بڑے آدمیوں کو خود بخود حاصل ہوتا ہے۔ یہ دوسری قسم کا اقتدار تو دراصل ایک ایسی جاہل، مطلق العنان خودی کا استبداد ہے جو اپنے سے بالاتر کسی حاکم کی مطیع، کسی ضابطہ وقانون کی پابند اور کسی علم صحیح کی متبع نہیں ہے۔ اس کو اپنی جسمانی اور نفسانی قوتوں پر جو فرمانروائی حاصل ہوتی ہے، لازم نہیں، بلکہ ممکن نہیں کہ وہ اسے صحیح مقصد کے لیے اور صحیح طریقہ پر استعمال کرے۔ دنیا میں سنیاس، رہبانیت اور ترک لذات کی بیماریاں اسی نوعیت کے اقتدار سے پیدا ہوئی ہیں۔ اسی اقتدار کی بدولت نفس اور جسم کے جائز حقوق چھینے گئے ہیں۔ اسی اقتدار کی بدولت انسان نے اپنی قابلیتوں کو تہذیب وتمدن کے ارتقاء میں صرف کرنے کے بجائے تنزل وانحطاط کی کوششوں میں صرف کیا ہے۔ اسی اقتدار کی بدولت دنیا کے بہت سے بڑے آدمیوں نے خدا کے بندوں پر اپنی خدائی مسلط کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی طاقتوں کو حق کے بجائے ظلم کی راہ میں استعمال کیا ہے۔ برعکس اس کے اسلامی روزہ جس خودی کو نفس وجسم پر اقتدار دیتا ہے وہ مطلق العنان خودی نہیں ہے بلکہ خدا اور اس کے قانون کی اطاعت کرنے والی خودی ہے۔ وہ جاہل خودی نہیں ہے، ایسی خودی نہیں ہے جو آپ اپنی رہنما ہو، بلکہ ایسی خودی ہے جو خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت، العلم، کتاب منیر کی رہنمائی میں چلنے والی ہے۔ وہ خدا کے دیے ہوئے نفس وجسم کو اپنی ملکیت

نہیں سمجھتی کہ اس پر قابو پا کر اپنی صواب دید کے مطابق جس طرح چاہے حکمرانی کرے، بلکہ وہ اسے خدا کی امانت سمجھتی ہے اور اس امانت پر خدا کے منشاء کے مطابق حکومت کرتی ہے۔ ایک مومن و متقی انسان جس کی خودی اللہ تعالیٰ کی رضا کے آگے سپر ڈال چکی ہو، دنیا کی کسی چیز پر بھی ظلم نہیں کر سکتا، کجا کہ خود اپنے جسم حیوانی کا حق مارے اور اپنے اس رفیق پر ظلم کرے جس کو اللہ نے مدۃ العمر کے لیے اس کا بہترین مددگار بنایا ہے۔ وہ اس کو اچھے سے اچھا کھلائے گا، اچھے سے اچھا پہنائے گا، بہتر سے بہتر مکان میں رکھے گا، زیادہ سے زیادہ آرام دے گا، اس کے ہر فطری جذبہ کی تسکین کا سامان فراہم کرے گا، نہ اس لیے کہ اس کا نفس یہ چاہتا ہے کہ ایسا کیا جائے، بلکہ اس لیے کہ خدا نے اس کا حق مقرر کیا ہے اور اس حق کو ادا کرنا خدا کی خوشنودی کا موجب ہے[1]۔ البتہ وہی نفس جب اچھا کھانے کے لیے حرام غذا یا حرام کی کمائی کا تقاضا کرے گا، جب اچھے لباس، اچھی سواری، اچھے مکان کے لیے ایسی تدبیریں اختیار کرنے کا مطالبہ کرے گا جنہیں اللہ نے پسند نہیں کیا ہے، جب وہ اپنے جذبات شہوانی کی تسکین کے لیے ایسے دروازے کھولنا چاہے گا جنہیں اللہ نے بند کیا ہے، جب وہ اپنی آرام طلبی کے لیے ان فریضوں اور ان خدمتوں کو ادا کرنے سے جی چرائے گا جو اللہ نے اس پر عائد کیے ہیں، اور جب وہ اس جگہ اپنی خواہشات اور خود اپنی قربانی دینے سے رکنا چاہے گا جہاں اللہ کی رضا ہے کہ اسے اور اس کی خواہشوں کو قربان کر دیا جائے، وہاں مومن کی خودی اپنے حاکمانہ اختیارات کو پوری شدت کے ساتھ استعمال کرے گی اور بجبر اس کو سرکشی و نافرمانی کے راستہ سے ہٹا کر فرمانبرداری کے سیدھے راستہ پر لے جائے گی۔ اسی چیز کی مشق مومن

[1] اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے اپنے نفس پر صدقہ کرو، پھر اپنے اہل و عیال پر، پھر دوسرے لوگوں پر۔ اپنے نفس پر صدقہ کرنا، یا اپنے اہل و عیال پر صدقہ کرنا ایک عجیب سا تخیل معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اسلام کا انداز فکر کچھ ہے ہی دنیا سے نرالا۔ یہاں جو شخص اپنی خواہش نفس سے کھاتا ہے وہ تو بس کھاتا ہے مگر جو خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا حق سمجھ کر اپنی حلال کی کمائی سے اپنے جسم کو غذا دیتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کو کھلاتا ہے وہ در اصل ایک ثواب کا کام کرتا ہے، ایک ایک لقمہ پر وہ اللہ کے ہاں اجر کا مستحق ہے۔

سے رمضان میں کرائی جاتی ہے تاکہ دنیا کی اس امتحان گاہ میں نازک مواقع جب پیش آئیں اور وہ روز ہر وقت پیش آتے ہیں ــــ تو اس کے ارادے کی باگیں اس منہ زور حیوان کو قابو میں رکھنے سے عاجز نہ رہ جائیں۔

انفرادی تربیت کا اجمالی نقشہ یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا تعلق افراد کی تربیت سے تھا۔ اب روزے کے اجتماعی پہلو کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ایک مجموعی نظر انفرادی تربیت کے اس پروگرام پر ڈال لیجیے۔

جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں، اسلام کا اصل مقصد صالحین کی ایسی جماعت بنانا ہے جو انسانی تمدن کو خیر و صلاح کی بنیادوں پر تعمیر کرے، مگر اس غرض کے لیے وہ صرف اجتماعی اصول وضع کرنے اور ان اصولوں کی بنیاد پر ایک نظام تمدن بنا دینے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ساتھ ساتھ اپنے جماعتی نظام کے لیے افراد کو تیار کرنے کا بھی انتظام کرتا ہے تاکہ جماعت (سوسائٹی) جن افراد پر مشتمل ہو ان میں کا ایک ایک شخص اپنے خیالات، اپنی سیرت، اور اپنے کردار کے لحاظ سے اس نظام کے ساتھ بیش از بیش موافقت رکھتا ہو، اور باغیانہ میلانات کے ساتھ مجبورانہ اطاعت کرنے کے بجائے اپنے نفس و روح کی پوری آمادگی، اپنے دل و دماغ کے مخلصانہ عقیدے، اور اپنی سیرت کی ذاتی قوت کے ساتھ اس کی پیروی کرے۔ اس اسکیم میں روزے کے رکن سے جو کام لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:-

۱۔ اس تربیت کے ذریعہ سے جماعت کے ہر فرد کو خداوند عالم کی حاکمیت کے مقابلہ میں اپنی خود مختاری سے عملاً دست بردار ہو جانے کے لیے تیار کیا جائے تاآنکہ وہ اپنی پوری زندگی کو الٰہی قانون کے تابع کر دے۔

۲۔ ہر فرد کے ذہن میں خدا کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے کا اور آخرت کی باز پرس کا عقیدہ عملی مشق و تمرین کے ذریعہ سے اس طرح جاگزیں کر دیا جائے کہ وہ خود اپنی شخصی ذمہ داری کے احساس

کی بنا پر، نہ کہ کسی خارجی دباؤ کی وجہ سے، قانون الٰہی کی خفیہ اور علانیہ اطاعت کرنے لگے۔

۳ - ہر فرد کے اندر یہ روح پھونک دی جائے کہ وہ ماسوی اللہ کی بندگی و اطاعت سے اعتقاداً و عملاً منکر ہو جائے اور اس کی بندگی اللہ کے لیے اس طرح خالص ہو جائے کہ جس حکم یا جس قانون یا جس اقتدار کے لیے اللہ کی طرف سے کوئی سند نہ ہو، اُس کی اطاعت کے لیے فردِ مومن کے نفس میں کوئی آمادگی بھی نہ ہو۔

۴ - ہر فرد کے ذہن کی ایسی تربیت کی جائے کہ دنیا کی زندگی میں اس کا نقطۂ نظر کلیۃً تبدیل ہو جائے۔ وہ مادّہ پرست، ابن الوقت، بندۂ مصلحت، اور دنیوی منافع کا غلام نہ ہو بلکہ اس کی نگاہ میں اصلی قدر و قیمت اخلاقی و روحانی منافع کی ہو، وہ ہر حال میں خداوند عالم کے مقرر کیے ہوئے اصولِ حیات کی پابندی کرے، اور دنیا کے عارضی فوائد یا نقصانات سے بے پروا ہو کر اُس راستی پر قائم رہے جس میں خدا کی رضا ہے۔

۵ - ہر فرد کی اخلاقی تربیت اس طور پر کی جائے کہ اسے اپنی خواہشات پر عملاً پورا اقتدار حاصل ہو، وہ اپنے نفس و جسم کی تمام قوتوں پر اتنا قابو رکھتا ہو کہ اپنے عقیدے اور علم و بصیرت کے مطابق ان سے کام لے سکے، اس میں صبر، تحمل، جفاکشی، توکل علی اللہ، اور ثابت قدمی و یکسوئی کی صفات پیدا ہو جائیں، اور اس کے کیرکٹر میں اتنی قوت آجائے کہ وہ خارجی ترغیبات اور اپنے نفس کے ناجائز میلانات کا مقابلہ کر سکے۔

یہی وہ مقاصد ہیں جن کے لیے اسلام نے رمضان کے روزے ہر اُس شخص پر فرض کیے ہیں جو اسلامی جماعت کا رکن ہو۔ کوئی عاقل و بالغ فرد، خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اس فریضہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ بیماری، سفر اور بعض دوسرے شرعی عذرات کی بنا پر کوئی شخص اس فرض کو ادا نہ کر سکتا ہو تو اُس پر قضا یا فدیہ لازم ہے۔ بہرحال اسلام کے دائرے میں رہ کر کوئی انسان روزے کی فرضیت سے چھوٹ نہیں سکتا۔

اگرچہ یہ لازم نہیں کہ روزے کی تربیت سے تمام افراد کے اندر وہ خصوصیات بدرجۂ اتم پیدا ہو جائیں جو اس سے پیدا کرنی مطلوب ہیں، کیونکہ ان کی پیدائش اور تکمیل کے لیے خود تربیت لینے والے میں ذاتی استعداد بھی ضروری ہے، لیکن بجائے خود اس نظام تربیت کی فطرت میں یہ خاصہ موجود ہے کہ اس سے یہ خصوصیات انسان میں پیدا ہوں، اور ان خصوصیات کو پیدا کرنے کے لیے اس سے بہتر، بلکہ اس کے سوا کوئی دوسرا نظام تربیت تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص صداقت پسندی کی نظر سے دیکھے تو اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ دنیا میں اسلام کے سوا کوئی اجتماعی نظام ایسا نہیں ہے جس نے افراد کو تیار کرنے کا اتنا وسیع وہمہ گیر انتظام کیا ہو کہ پوری کی پوری آبادیاں اس کے دائرے میں آکر خود بخود اخلاقی تربیت پاتی چلی جائیں۔

پھر اس کا مزید کمال یہ ہے کہ سوسائٹی کے حدود میں اگر کوئی فرد ایسا ناقص نکل آئے کہ اس اجتماعی نظام کا جز بن کر نہ رہ سکتا ہو، تو وہ خود بخود الگ ممتاز ہو جاتا ہے۔ جہاں اس نے بغیر عذر شرعی کے روزہ ترک کیا اور فوراً ہی یہ بات سوسائٹی پر آشکارا ہو گئی کہ اس کے درمیان ایک منافق موجود ہے جو خدا کی حاکمیت تسلیم نہیں کرتا اور اپنی حیوانی جبلت کا بندہ بن کر رہنا چاہتا ہے۔ اس صریح علامت سے سوسائٹی کو اپنے جسم میں ایک سڑے ہوئے عضو کی موجودگی کا بر وقت علم ہو جاتا ہے، اور اس کو موقع مل جاتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے زہر سے محفوظ کرے ——— کم از کم اسلام نے تو اپنی حد تک منافقین کی نشان دہی کا پورا انتظام کر دیا ہے اور ہر مسلم سوسائٹی کے لیے اس بات کا موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ عین وقت پر ان کے وجود سے آگاہ ہو کر یا ان کی اصلاح کرے یا انہیں اپنے دائرے سے خارج کر دے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ کوئی بے حس نام نہاد مسلم سوسائٹی اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھائے اور ایسے لوگوں کو نہ صرف اپنی گود میں پرورش کرے، بلکہ انہیں اپنے سر پر بٹھائے اور زندہ باد کے نعرے لگائے!

روزے کا اجتماعی پہلو نماز کی طرح روزہ بھی بجائے خود ایک انفرادی فعل ہے، لیکن جس طرح نماز کے ساتھ جماعت کی شرط لگا کر اس کو انفرادی سے اجتماعی فعل میں تبدیل کر دیا گیا ہے، اسی طرح روزے کو بھی ایک ذرا سی حکیمانہ تدبیر نے انفرادی عمل کے بجائے اجتماعی عمل بنا کر اس کے فوائد و منافع کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تدبیر بس اتنی سی ہے کہ روزے رکھنے کے لیے ایک خاص مہینہ مقرر کر دیا گیا۔ اگر شارع کے پیشِ نظر محض افراد کی اخلاقی تربیت ہوتی تو اس کے لیے یہ حکم دینا کافی تھا کہ ہر مسلمان سال بھر کے دوران میں کبھی تیس دن کے روزے رکھ لیا کرے۔ اس طرح وہ تمام مقاصد پورے ہو سکتے تھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، بلکہ ضبطِ نفس کی مشق کے لیے یہ صورت زیادہ مناسب تھی کیونکہ اجتماعی عمل سے روزہ رکھنے میں جو آسانی افراد کے لیے پیدا ہو جاتی ہے وہ انفرادی عمل کی صورت میں نہ ہوتی اور ہر شخص کو اپنا فرض ادا کرنے میں نسبتاً زیادہ شدت کے ساتھ اپنی قوت ارادی استعمال کرنی پڑتی۔ لیکن اسلام کا قانون جس حکیم نے بنایا ہے اس کی نگاہ میں افراد کی ایسی تیاری کسی کام کی نہیں ہے جس کے نتیجہ میں ایک جماعت صالحہ وجود میں نہ آئے، اس لیے اس نے روزے کو محض ایک انفرادی عمل بنانا پسند نہیں کیا بلکہ سال بھر میں ایک مہینہ روزے کے لیے مخصوص کر دیا تاکہ سب مسلمان بیک وقت روزہ رکھیں اور وہی نظام تربیت جس سے افراد تیار ہوں، ایک صالح اجتماعی نظام بنانے میں بھی مددگار ہو جائے۔

اس حکیمانہ تدبیر سے روزے کے اخلاقی و روحانی منافع میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی طرف یہاں چند مختصر اشارات کیے جاتے ہیں۔

تقویٰ کی فضا اجتماعی عمل کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص انفرادی طور پر کسی خاص ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو اور اس کے گرد و پیش دوسرے لوگوں میں نہ وہ ذہنی کیفیت ہو اور نہ وہ اُس کام میں اس کے شریک ہوں،

تو وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں بالکل اجنبی پائے گا، اس کی کیفیت ذہنی صرف اسی کی ذات تک محدود اور صرف اسی کی نفسی قوتوں پر منحصر رہے گی، اس کو نشو ونما پانے کے لیے ماحول سے کوئی مدد نہ ملے گی، بلکہ ماحول کے مختلف اثرات اس کیفیت کو بڑھانے کے بجائے الٹا گھٹا دیں گے لیکن اگر وہی کیفیت پورے ماحول پر طاری ہو، اگر تمام لوگ ایک ہی خیال اور ایک ہی ذہنیت کے ماتحت ایک ہی عمل کر رہے ہوں، تو معاملہ برعکس ہوگا۔ اس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی جس میں پوری جماعت پر وہی ایک کیفیت چھائی ہوئی ہوگی اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی خارجی اعانت سے غذا لے کر بے حد وحساب بڑھتی چلی جائے گی۔ ایک شخص اکیلا برہنہ ہو اور گرد وپیش سب لوگ کپڑے پہنے ہوئے ہوں تو وہ کس قدر شرمائے گا؟ بے حیائی کی کتنی بڑی مقدار اس کو برہنہ ہونے کے لیے درکار ہوگی اور پھر بھی ماحول کے مخالف اثرات سے اس کی شدید بے حیائی بھی کس طرح بار بار شکست کھائے گی؟ لیکن جہاں ایک حمام میں سب ننگے ہوں وہاں شرم بے چاری کو پھٹکنے کا موقع بھی نہ ملے گا اور ہر شخص کی بے شرمی دوسروں کی بے شرمی سے مدد پاکر افزوں و رافزوں ہوتی چلی جائے گی۔ ایک ایک سپاہی کا الگ الگ جنگ کرنا اور مہالکِ جنگ برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے؟ مگر جہاں فوج کی فوج ایک ساتھ مارچ کر رہی ہو وہاں جذبات شہامت وحماست کا ایک طوفان امڈ آتا ہے جس میں ہر سپاہی مستانہ وار بہتا چلا جاتا ہے نیکی ہو یا بدی، دونوں کی ترقی میں اجتماعی نفسیات کو غیر معمولی دخل حاصل ہے۔ جماعت مل کر بدی کر رہی ہو تو فحش، بے حیائی اور بدکاری کے جذبات ابل پڑتے ہیں، اور جماعت مل کر نیکی کر رہی ہو تو پاکیزہ خیالات اور نیک جذبات کا سیلاب آجاتا ہے جس میں بد بھی نیک بن جاتے ہیں خواہ تھوڑی دیر ہی کے لیے سہی۔

اجتماعی روزے کا مہینہ قرار دے کر رمضان سے شارع نے یہی کام لیا ہے جس طرح آپ

دیکھتے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھولتا ہے اور ہر طرف کھیتیوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے، اسی طرح رمضان کا مہینہ گویا خیر و صلاح اور تقویٰ و طہارت کا موسم ہے جس میں بُرائیاں دبتی ہیں، نیکیاں پھلتی ہیں، پوری پوری آبادیوں پر خوفِ خدا اور حُبِّ خیر کی روح چھا جاتی ہے، اور ہر طرف پرہیزگاری کی کھیتی سرسبز نظر آنے لگتی ہے۔ اس زمانہ میں گناہ کرتے ہوئے آدمی کو شرم آتی ہے، ہر شخص خود گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، اور اپنے کسی دوسرے بھائی کو گناہ کرتے دیکھ کر اسے شرم دلاتا ہے۔ ہر ایک کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچھ بھلائی کا کام کرے، کسی غریب کو کھانا کھلائے، کسی ننگے کو کپڑا پہنائے، کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے، کہیں کوئی نیک کام ہو رہا ہو تو اس میں حصہ لے، کہیں کوئی بدی ہو رہی ہو تو اسے روکے۔ اس وقت لوگوں کے دل نرم ہو جاتے ہیں، ظلم سے ہاتھ رُک جاتے ہیں، بُرائی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت پیدا ہو جاتی ہے، توبہ اور خشیت و انابت کی طرف طبیعتیں مائل ہوتی ہیں، نیک بہت نیک ہو جاتے ہیں، اور بدوں کی بدی اگر نیکی میں تبدیل نہیں ہوتی تب بھی اس جلاب سے اس کا اچھا خاصہ تنقیہ ضرور ہو جاتا ہے۔ غرض اس زبردست حکیمانہ تدبیر سے شارع نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ ہر سال ایک مہینہ کے لیے پوری اسلامی آبادی کی صفائی ہوتی رہے، اس کو اوورہال کیا جاتا ہے، اس کی کایا پلٹی جائے اور اس میں مجموعی حیثیت سے روحِ اسلامی کو از سرِ نو زندہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اذا دخل رمضان فتحت ابواب الجنة وغلقت ابواب جهنم و سلسلت الشياطين۔	جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین باندھ دیئے جاتے ہیں۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

اذا كان اول ليلة من شهر رمضان	جب رمضان کی پہلی تاریخ آتی ہے تو شیاطین اور

صفدت الشیاطین و مردة الجن وغلقت ابواب النار فلم یفتح منها باب وفتحت ابواب الجنة فلم یغلق منها باب وینادی مناد یا باغی الخیر اقبل ویا باغی الشر اقصر۔	سرکش جن باندھ دیے جاتے ہیں۔ دوزخ کی طرف جانے کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں، اُن میں سے کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا۔ اور جنت کی طرف جانے کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، اُن میں سے کوئی دروازہ بند نہیں رہتا۔ اس وقت پکارنے والا پکارتا ہے اے بھلائی کے طالب آگے بڑھ اور اے بُرائی کے خواہش مند ٹھیر جا۔

سکتہ کے مریض کا آخری امتحان اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس کی ناک کے پاس آئینہ رکھتے ہیں۔ اگر آئینہ پر کچھ دھندلاہٹ سی پیدا ہو تو سمجھتے ہیں کہ ابھی جان باقی ہے، ورنہ اس کی زندگی کی آخری امید بھی منقطع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی کسی بستی کا تمہیں امتحان لینا ہو تو اسے رمضان کے زمانہ میں دیکھو۔ اگر اس مہینہ میں ان کے اندر کچھ تقویٰ، کچھ خوف خدا، کچھ نیکی کے جذبہ کا اُبھار نظر آئے تو سمجھو ابھی زندہ ہیں۔ اور اگر اس مہینہ میں بھی نیکی کا بازار سرد ہو، فسق و فجور کے آثار نمایاں ہوں، اور اسلامی حس مُردہ نظر آئے تو انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھ لو۔ اس کے بعد زندگی کا کوئی سانس مسلمان کے لیے مقدر نہیں ہے[1]۔

[1] یہ تو ہے امتحان کا اسلامی معیار۔ مگر اب اس جانچ کے لیے کچھ دوسرے معیار ایجاد ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی آبادی غلام ہو تو اس کا امتحان یوں لیا جاتا ہے کہ قومی مفاد (یعنی قوم کے معاشی و سیاسی مفاد) کے لیے ان میں کتنی تڑپ ہے، اس مفاد کی حفاظت کے لیے وہ کہاں تک بل کر چیختے ہیں اور جلسوں میں اسلام اور اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت کا نام کس جوش و خروش سے لیا جاتا ہے۔ اور اگر وہ آبادی آزاد ہو تو اُس کی زندگی کا امتحان لینے کے لیے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے ہوائی جہاز کتنے مہیا کیے، ریلیں کتنی بنائیں، مدرسے اور کارخانے کس قدر قائم کیے، اپنی عورتوں کو بے حیائی میں کہاں تک طاق کیا، اور تہذیب و تمدن اور معاشرت میں یورپ سے لگا کھانے کی کہاں تک کامیاب کوشش کی۔ ان آزمائشوں میں اگر کوئی آبادی پوری اُتر گئی تو کہا جاتا ہے کہ الحمد للہ اسلام زندہ ہے اور بس "ہونا ہے جادہ پیما اب کارواں ہمارا"!

جماعتی احساس اجتماعی عمل کا دوسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں فطری اور اصلی وحدت پیدا ہوتی ہے نسل یا زبان یا مرز بوم یا معاشی اغراض کا اشتراک فطری نوعیت پیدا نہیں کرتا آدمی کا دل صرف اسی سے ملتا ہے جو خیالات اور عمل میں اُس سے ملتا ہو۔ یہ اصلی رشتہ ہے جو دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے باندھتا ہے۔ اور جس کے ساتھ خیالات اور عمل میں اتفاق نہ ہو اس سے کبھی دل نہیں ملتا خواہ دونوں ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہوں جب کوئی شخص اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو ذہنیت اور عمل میں اپنے سے مختلف پاتا ہے تو صریح طور پر اپنے آپ کو ان کے درمیان اجنبی محسوس کرتا ہے۔ مگر جب بہت سے لوگ مل کر ایک ہی ذہنی کیفیت کے ساتھ ایک ہی عمل کرتے ہیں تو ان میں باہم یگانگت، رفاقت، یک جہتی اور برادری کے گہرے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ قلب و روح کا اشتراک اور عمل کا اتفاق ان کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دیتا ہے۔

خواہ نیکی ہو یا بدی، دونوں صورتوں میں اجتماعی نفسیات اسی طرح کام کرتے ہیں۔ چوروں میں چوری کا اشتراک اور شرابیوں میں مے نوشی کا اشتراک بھی یونہی برادری پیدا کرتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ بدی کے راستہ میں افراد کی نفسانیت کا دخل رہتا ہے جس کا فطری میلان فرد فرد کو پھاڑ کر الگ کر دینے کی طرف ہے، اس لیے ایسے راستوں میں برادری کبھی بے آلائش اور مستحکم نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے نیکی کے راستہ میں نفسانیت دبتی ہے، انسانی روح کو حقیقی تسکین ملتی ہے، اور پاک جذبات کے ساتھ آدمی اس راستہ پر چلتا ہے، اس لیے نیک خیالات اور نیک عمل کا اشتراک وہ بہترین رشتۂ اخوت پیدا کرتا ہے جس سے زیادہ مستحکم اجتماعی رابطہ کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

نماز باجماعت کی طرح رمضان کے اجتماعی روزے مسلمانوں میں اسی نوع کی برادری پیدا کرتے ہیں۔ تمام لوگوں کا مل کر ایک خدا کی رضا چاہنا، اسی کی رضا کے لیے بھوک پیاس کی تکلیف

اُٹھانا، اسی کے خوف سے بُرائیوں کو چھوڑنا اور ایک دوسرے کو بُرائیوں سے روکنا، اسی کی محبت میں بھلائیوں کی طرف دوڑنا اور ایک دوسرے کو بھلائی پر اکسانا، یہ چیز اُن میں بہترین قسم کی وحدت، صحیح ترین فطری قومیت، پاکیزہ ترین اجتماعی ذہنیت، اور ایسی ہمدردی و رفاقت پیدا کرتی ہے جو ہر کھوٹ سے خالی ہے۔

امداد باہمی کی روح اس اجتماعی عبادت کا تیسرا زبردست کام یہ ہے کہ یہ عارضی طور پر تمام لوگوں کو ایک سطح پر لے آتی ہے۔ اگرچہ امیر امیر ہی رہتا ہے اور غریب، غریب لیکن روزہ چند گھنٹوں کے لیے امیر پر بھی وہ کیفیت طاری کر دیتا ہے جو اس کے فاقہ کش بھائی پر گذرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مصیبت کو حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے، اور خدا کی رضا چاہنے کا جذبہ اُسے اپنے غریب بھائیوں کی مدد کرنے پر اکساتا ہے۔ بظاہر یہ ایک بڑی چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے اخلاقی و تمدنی فوائد بے شمار ہیں۔ جس قوم کے امیروں میں غریبوں کی تکالیف کا احساس اور ان کی عملی ہمدردی کا جذبہ ہو، اور جہاں صرف اداروں ہی کو خیرات نہ دی جاتی ہو بلکہ فرداً فرداً بھی حاجت مندوں کو تلاش کر کے مدد پہنچائی جاتی ہو، وہاں نہ صرف یہ کہ قوم کے کمزور حصے تباہ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں، نہ صرف یہ کہ اجتماعی فلاح برقرار رہتی ہے، بلکہ غربت اور امارت میں حسد کے بجائے محبت کا، شکرگذاری اور احسان مندی کا تعلق قائم ہوتا ہے اور وہ طبقاتی جنگ کبھی رونما نہیں ہو سکتی جو اُن قوموں میں برپا ہوتی ہے جن کے مالدار لوگ جانتے ہی نہیں کہ فقر و فاقہ کیا چیز ہوتی ہے، جو قحط کے زمانہ میں تعجب سے پوچھتے ہیں کہ لوگ بھوکے کیوں مر رہے ہیں، انہیں روٹی نہیں ملتی تو یہ کیک کیوں نہیں کھاتے؟

یہ اسلام کا دوسرا عملی رکن ہے جس کے ذریعہ سے اسلام اپنے افراد کو فرداً فرداً ایک خاص قسم کی اخلاقی تربیت دے کر تیار کرتا ہے اور پھر انہیں جوڑ کر ایک خاص طرز کی جماعت بناتا ہے۔ اسلام کا آخری مقصد جس مدنیت صالحہ اور حکومت الٰہیہ کو وجود میں لانا ہے اس کے اجزائے ترکیبی اس طرح نماز اور روزے کے ذریعہ سے چھیل بنا کر تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے سپاہی اور جنرل، اُس کے اہل کار، عہدہ دار اور وزراء، اُس کے معلّم اور پروفیسر، اُس کے قاضی اور مفتی، اُس کے تاجر، مزدور، کارخانہ دار اور کسان، اُس کے رائے دہندے، نمائندے اور شہری، سب اس تربیت کے بعد کہیں اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے اجتماع سے وہ صالح تمدنی و سیاسی نظام بن سکے جسے "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ محض ان کھڑ افراد کو لے کر خلافت الٰہیہ قائم کرنے کے لیے دوڑ جانا ایسی خام خیالی و خام کاری ہے جس سے اللہ اور اس کا رسول بری ہیں۔

ابھی اس انفرادی و اجتماعی تربیت کا پروگرام ختم نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ ایک تیسرا عملی رکن زکوٰۃ بھی ہے جسے ہم آگے بیان کریں گے۔

(باقی)

اطلاع

گوجرانوالہ شہر میں ترجمان القرآن کی ایجنسی حسب ذیل پتہ پر قائم کی گئی ہے۔ جہاں سے اس ادارہ کی تمام مطبوعات ہر وقت مل سکتی ہیں۔

"سید لال شاہ صاحب۔ برانچ پوسٹماسٹر۔ نزد اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ"

منیجر رسالہ ترجمان القرآن لاہور

مطبوعات

دین اور اس کی حقیقت تالیف ڈاکٹر عبد الجبار خیری صاحب۔ ضخامت ۳۲۰ صفحات۔ قیمت عہ

پتہ:- غرفہ، پہاڑی املی، دہلی۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے دین کے معنی اور ماہیت کی تشریح کرنے کے بعد نہایت معقول اور مضبوط دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ دین صرف اسلام ہے، اور اس وقت دنیا میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں ان میں سے کسی پر لفظ دین کا اطلاق نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان میں سے کسی میں وہ شرائط نہیں پائی جاتیں جو کسی مذہب کے "دین" ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے صحیح علمی طریق پر دین کو جانچنے کے لیے پہلے ایک معیار تنقید متعین کیا ہے، پھر ہندو، جین، بدھ، سکھ، آریہ، پارسی، یہودی اور عیسائی مذاہب میں سے ایک ایک کو اس کسوٹی پر جانچ کر کھوٹا ثابت کر دیا ہے۔ اور آخر میں اسلام کو اس کسوٹی پر کس کر یہ دکھایا ہے کہ اس دین میں ایک ایک امر تنقیح طلب کا پورا جواب ملتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اگرچہ دہلی کے باشندے ہیں مگر ان کی عمر کا بہت بڑا حصہ ہندوستان سے باہر گزرا ہے اس لیے ان کو اردو زبان پر وہ قدرت حاصل نہیں رہی ہے جو ان مضامین کو بیان کرنے کے لیے ضروری ہے۔ بکثرت مقامات پر عبارات کی بے ربطی اور بیان کی کوتاہی صاف محسوس ہوتی ہے۔ بہت سی جگہ مضامین کی غیر ضروری تکرار ہے کہیں کہیں غیر متعلق مباحث بیچ میں آکر بیان کی منطقی ترتیب میں خلل ڈال دیتے ہیں۔ یہ کمزوریاں اگر نہ ہوتیں تو کتاب کی قوتِ تاثیر بہت بڑھ جاتی۔

فاضل مصنف نے اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یورپ اور ہندوستان کے بہت سے لوگوں کی رائیں اس کثرت سے نقل کی ہیں کہ کتاب کا ایک بڑا حصہ ان کی نذر ہو گیا ہے۔ یہ چیز

ہماری نگاہ میں بُری طرح کھٹکتی ہے۔ اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بہت بالا و برتر ہیں کہ ان کو کسی غیر مسلم کے سرٹیفکیٹ یا شہادت (TESTIMONIAL) کی حاجت ہو۔ جس اندھے کو قرآن اور سیرت محمدیؐ میں نورِ حق نظر ہی نہ آیا، یا جس بندۂ ہوس نے حق کو حق جاننے کے باوجود اس کا اتباع کرنے کی جرأت نہ کی، وہ کہاں اس قابل ہو سکتا ہے کہ اللہ کے دین اور اس کے نبیؐ کے متعلق اس کی رائے کو کوئی وزن دیا جائے۔

مضامین محمد علی (حصہ اوّل) مرتبہ محمد سرور صاحب استاذ تاریخ اسلام، جامعہ ملیہ دہلی ضخامت ۵۹۰ صفحات مجلد بجلد نفیس۔ قیمت عہ۔ مکتبہ جامعہ، دہلی۔

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مسلمانوں کی تاریخ دو دوروں پر تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پہلا دور سر سید احمد خاں کا دور ہے جس میں مسلمان، ایک مسلک اور ایک مشن رکھنے والی جماعت کے بجائے محض ایک "قوم" بن کر رہ گئے اور اس قوم کی پالیسی یہ قرار پائی کہ اپنی دنیا بنانے کے لیے وقت اور موقع کے لحاظ سے جو طریقہ کارگر نظر آئے بے تکلف استعمال کیا جائے۔ اگرچہ نام پھر بھی اسلام اور مسلمان ہی کا لیا جاتا تھا مگر جو ذہنیت اس دور میں کار فرما تھی اس کا عطر حالیؔ نے اپنے اس مصرع میں کھینچ کر رکھ دیا ہے کہ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"۔ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ زمانہ میں یہ دور اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ گیا اور اس کے بعد اسی کے بطن سے ایک دوسرا دور پیدا ہوا جسے محمد علی، ابوالکلام اور اقبال کا دور کہنا چاہیے۔ یہ دور متضاد اور بے جوڑ عناصر کا ایک ایسا عجیب مجموعہ تھا جس کے مختلف اجزاء میں کوئی منطقی ربط نہ تھا اور اسی لیے آخر وقت تک ان کی ترکیب سے کوئی متحد المزاج نظامِ فکر و عمل نہ بن سکا۔ ایک طرف تو اس دور میں وہ اسلامی شعور جو دورِ اول میں موت کے قریب پہنچ چکا تھا، از سرِ نو بیدار ہوا اور لوگ اسلام کو اس کی اصلی صورت میں دیکھنے لگے، مگر دوسری طرف وہ "مسلم قومیت" جو دورِ اول میں پیدا ہوئی تھی ترقی کر کے "مسلم قوم پرستی" میں تبدیل ہو گئی، اور اس دور کے رہنما آخر وقت تک اسلام اور مسلم قوم پرستی کے اصولی فرق کو نہ سمجھ سکے۔ ایک طرف اسلام کا نظریۂ اجتماع اور تصورِ حکومت واضح صورت میں لوگوں کے

سامنے آیا، اور دوسری طرف اُس بے معنی خلافت کی حمایت بھی کی گئی جس پر اسلامی اصطلاح "خلافت" کا اطلاق کسی طرح نہ ہو سکتا تھا، اُس ہندوستانی سوراج کے اندر اپنی جگہ بھی تلاش کی جاتی رہی جس کا بنیادی نظریہ اسلام کے نظریۂ سیاسی سے کوئی دُور کی نسبت بھی نہ رکھتا تھا، اُس غلط جمہوریت کو بھی تسلیم کر لیا گیا جو اسلام کے تصورِ جمہوریت سے کلیتہً و اصولاً مختلف تھی۔ پھر ایک طرف تو اس دَور میں خالص اسلامی آئیڈیلزم کی جھلک نظر آتی ہے، اور دوسری طرف ماحول کو سازگار بنانے کے بجائے خود ماحول سے سازگار بننے کی کمزوری بھی پائی جاتی ہے، اور تمام دماغی و عملی قوتیں وقتی و ہنگامی حالات کے لحاظ سے پالیسیاں بنانے اور بدلنے میں صرف کر دی جاتی ہیں۔ غرض یہ ایسی پراگندہ خیالی اور ایسے خلط مبحث کا دَور تھا جس کی الجھنوں میں آخر وقت تک مسلمان اصولی حیثیت سے یہ طے نہ کر سکے کہ ہم فی الواقع ہیں کیا اور ہمیں اس سرزمین میں اپنی کس حیثیت کو قائم کرنے کے لیے مجاہدہ کرنا چاہیے۔ یہ دَور اپنے دو لیڈروں کی وفات اور تیسرے لیڈر کی شخصیت کے انقلاب تام سے اختتام کو پہنچ چکا ہے اور ابھی کوئی تیسرا دَور کم از کم اتنی واضح امتیازی خصوصیات کے ساتھ شروع نہیں ہوا ہے کہ اس کے مزاج کی تشخیص کی جا سکے۔ بہرحال جو دَور بھی پیدا ہوگا اس کا گہرا تعلق اپنے قریب ترین ماضی سے ضرور رہے گا اور اس کے مسائل کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہوگا کہ سابق کا دَور جن معماروں کے ہاتھوں سے بنا تھا اُن کو، اور اُن کے خیالات اور اُن کے نقشوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

پروفیسر محمد سرور صاحب نے یہ ایک بڑی خدمت انجام دی ہے کہ دَورِ دوم کے فاتح، مولانا محمد علی مرحوم و مغفور کے مضامین مرتب کر کے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابوالکلام اور اقبال اس دَور کے دماغ تھے مگر محمد علی اس کا دل تھا اور بڑا ہی متحرک دل۔ اُس کے اندر وضع احتیاط مفقود تھی، اس وجہ سے ہم اس کی تحریروں میں اُس کی شخصیت کو بالکل بے پردہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی سیرت، اس کے خیالات، اس کے عزائم، اس کے منصوبے، اور وہ طرزِ خاص جس سے وہ اپنے

پیش نظر مسائل کو سمجھتا اور حل کرتا تھا، سب کے سب آئینے کی طرح ہمارے سامنے آجاتے ہیں، اور اس روشنی میں ہم معاملات اور مسائل اور ذہنیتوں کے اُس ورثہ کو بڑی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو اپنے ماضی قریب سے ہمیں ملا ہے۔

دنیا کی کہانی پروفیسر محمد مجیب صاحب۔ ضخامت ۲۲۷ صفحات۔ قیمت ؏ مکتبہ جامعہ دہلی

یہ فاضل پروفیسر کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر تیار کی تھیں۔ ان میں دنیا کے آغاز سے لے کر اس زمانہ تک انسان اور انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کو دلچسپ کہانی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ نوجوان طلبہ کو تاریخ تمدن سے آگاہ کرنے کے لیے یہ ایک عمدہ مجموعہ ہے۔

اسلام کی تہذیب کو بیان کرتے ہوئے پروفیسر صاحب نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ "اسلام نے دولت کو امانت قرار دیا ہے اور جماعت جب چاہے اس دولت کو واپس لے سکتی ہے یا اسے نئے سرے سے تقسیم کر سکتی ہے"۔ اسی طرح انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "جماعت جب چاہے ایک سے زیادہ شادی کرنے کی ممانعت کر سکتی ہے"۔ اور یہ کہ "ہندوستان میں پردے کی جو رسم قائم ہوئی اس کے لیے اسلامی قانون میں کوئی سند نہیں"۔ یہ سب بیانات غیر صحیح ہیں ایک محقق سے ہم بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ جن امور کے متعلق اس کے پاس ذرائع معلومات نہ ہوں اُن پر قطعی رائے ظاہر کرنے سے وہ اجتناب کرے گا۔

انتخاب الہلال ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت مجلد ؏ غیر مجلد ؏۔ پتہ: دلبستان، چابک سواراں اسٹریٹ، لاہور

یہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بعض ان مضامین کا مجموعہ ہے جو الہلال کے دور اول میں شائع ہوئے تھے۔ مرتب نے جن جن مضامین کو پسند کیا انہیں جمع کر دیا ہے۔ گویا کوئی خاص ترتیب ان کے پیش نظر نہ تھی۔ ضرورت ہے کہ مضامین محمد علی کی طرح مضامین آزاد کو بھی باقاعدہ ایڈٹ کر کے شائع کیا جائے۔

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائل اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموما لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلا توحید' ہدایت و ضلالت' عبادت' جہاد' آزادی' رواداری' قومیت اسلامی' عقیدۂ توحید کے ساتھہ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا' رسول کی صحیح حیثیت' رسالت محمدی کا ثبوت عقلی' شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق' منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول بیجلد ایکروپیہ آٹھہ آنے قیمت مجلد دو روپیہ علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم' اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہیں۔